کارل مارکس کے 130 سال بعد بھی

مارکسزم

عہدِ حاضر کا واحد سچ

تحریر: ایلن ووڈز
ترجمہ: اسد پتافی

طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز

Ketabton.com

(c) ketabton.com: The Digital Library

دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

"Relevance of Marxism Today"

By: Alan Woods

'جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں'

نام کتاب: مارکسزم عہدِ حاضر کا واحد سچ

مصنف: ایلن ووڈز

مترجم: اسد پتافی

ایڈیشن: جون 2013ء

تعداد اشاعت: 2200

ناشر: طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز 105 منگل مینشن رائل پارک لکشمی چوک لاہور

فون: 042-36316214 فیکس: 042-36365659

پرنٹرز: یاسر عمیر پرنٹرز

صفحات: 104

قیمت: 200 روپے

e-mail: editor@struggle.com.pk

www.struggle.com.pk

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.marxist.com

فہرست

پیش لفظ	7
مارکسی نظریات کی تصدیق	16
موجودہ عہد میں مارکسزم کی افادیت	17
بورژوا ماہرین کا نظریاتی ابہام	19
کمیونسٹ مینی فیسٹو	22
عالمگیریت اور نابرابری	24
بیروزگاری کا طاعون	27
زائد پیداوار کا بحران	30
بیگانگی	31
طبقاتی جدوجہد	33
خیال پرستی اور مادہ پرستی	35
مارکس اور ڈارون	38
تاریخی مادیت	40
تاریخ کی قوتِ محرکہ	43
تاریخ کی رنگارنگی	45
سماجوں کا عروج وزوال	47
ریاست	51
بورژوازی کا ابھار	56

(c) ketabton.com: The Digital Library

مارکسزم کا بھونڈی تشریح 59	
مارکسی فلسفہ	62
مارکس اور ہیگل	64
مارکس کا فلسفیانہ انقلاب	65
جدلیات کیا ہے؟	68
مقدار اور معیار	70
جدلیات بمقابلہ تجربیت	72
جدلیات اور سائنس	74
دیوالیہ ہوتی دنیا	78
''تمام راستے تباہی کا جانب''	81
ثقافت کو درپیش خطرہ	84
منصوبہ بند معیشت کی ضرورت	87
سوشلزم اور بین الاقوامیت	90
کیا کوئی متبادل نہیں ہے؟	93
واحد راستہ!	95
ضمیمہ: کارل مارکس کے ناقابلِ شکست نظریات	99

(c) ketabton.com: The Digital Library

پیش لفظ

ایک چوتھائی صدی انسانی زندگی میں تو شاید ایک طویل عرصہ ہو لیکن انسانی تاریخ میں یہ چند لمحوں سے بھی کم حیثیت رکھتی ہے۔ 1980ء کی دھائی میں عالمی سطح پر ہونے والے واقعات نے ایک ایسے عہد کو جنم دیا جو شاید جدید انسانی تاریخ کے رجعتی عہدوں میں شمار ہوتا ہے۔ چین میں افسر شاہی کے سرمایہ داری نواز گروہ نے 1978ء کے بعد چین میں منصوبہ بند معیشت کو ختم کرنے اور منڈی کی سرمایہ دارانہ معیشت کو دوبارہ استوار کرنے کا عمل شروع کیا۔ اسی طرح 1980ء کی دھائی کے اواخر میں مشرقی یورپ کے ممالک میں سٹالنزم کا انہدام دیوار برلن کا گرنا اور پھر سوویت یونین کا ٹوٹ جانا ایسے دیو قامت واقعات تھے جن کے دنیا بھر کے محنت کشوں اور نوجوانوں پر گہرے اور منفی اثرات مرتب ہوئے۔ سامراجی ذرائع ابلاغ نے ان واقعات سے قبل کی نصف صدی میں سوویت یونین، چین اور دوسرے سٹالنسٹ ممالک کو ''سوشلسٹ'' اور ''کمیونسٹ'' بنا کر پیش کیا تھا۔ اس میں نہ صرف ان ممالک کی حکمران ''کمیونسٹ'' پارٹیوں، جو دراصل مراعات یافتہ آمرانہ افسر شاہیاں تھیں، نے کمیونزم اور سوشلزم کے نام پر اپنے جابرانہ اقتدار کو طوالت دی اور انہی ناموں کے ذریعے اپنی پیرو کار کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں کو دنیا بھر کے تمام ممالک میں اپنی عالمی حمایت کا آلہ کار بنا کر سوشلزم اور کمیونزم کی مارکسی تعریف، تشریح اور شکل ہی بدل کر رکھ دی۔ سٹالنزم نے جو جرائم کئے اور ظلم و جبر کا جو کھلواڑ کیا اس کو مارکسزم کے نام سے منسوب کیا جاتا رہا۔ لیکن ان کا یہ واردات کر جانا دو بنیادی وجوہات کی بنیاد پر ممکن ہو سکا تھا۔

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس سٹالنسٹ جبر کے باوجود نجی ملکیت اور منڈی کی معیشت کی بجائے

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہاں کی ریاستی ملکیت اور منصوبہ بند معیشت قائم تھی یا ہوئی جس سے ان سماجوں میں بے پناہ ترقی حاصل ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد خصوصی طور پر ایک جانب سوویت یونین اور چین میں برق رفتار معاشی نمو اور دوسری جانب امریکہ، یورپ اور دوسرے ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں جنگ کی تباہ کاریوں سے تعمیر نو کے لیے جو پیداوار کی کھپت ہوئی اس سے سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ کا سب سے بڑا عروج 73-1948ء تک آیا جس میں ترقی یافتہ ممالک کے محنت کشوں اور عام عوام کے معیارِ زندگی میں خاطر خواہ بہتری آئی۔ اس ''عملی'' اور ساری ترقی کی وجہ سے حقیقی مارکسی قوتیں تڑپ کر رہ گئیں۔ ترقیوں کے اس شور میں مارکسسٹوں کی آواز گُھٹ کر رہ گئی۔ ان حالات میں ایک طرف تو مغربی سامراجی میڈیا ان کو انتہا پسند گروہ گردان کر ان کی تضحیک اور تذلیل کرتا رہا اور دوسری جانب ٹراٹسکی کے 1940ء کے قتل سے لے کر سوویت یونین کے انہدام تک مارکسسٹوں کے ساتھ سٹالنسٹ بیوروکریسی نے انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا۔ روس نواز اور چین نواز کمیونسٹوں نے ان کو ہر سیاسی اور مزدور تحریک سے بے دخل کر دیا۔ لیکن نوآبادیاتی ممالک میں نہ صرف ان کا ناطقہ بند کر دیا گیا بلکہ ان پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا گیا۔ المیہ یہ ہے کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے اور چین میں وحشیانہ سرمایہ داری کی بحالی کے بعد یہی بڑے بڑے کمیونسٹ اور سوشلسٹ لیڈر سرمایہ داری کے آگے گھٹنے ٹیک کر مارکسزم کو مسترد کرنے والے پراپیگنڈے کی یلغار کے ہراول جغادری بن گئے۔ اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جن مارکسسٹوں کو یہ سٹالنسٹ سی آئی اے کے ایجنٹ قرار دیتے تھے انہی مارکسسٹوں کو آج سٹالنزم کے تمام تر جرائم کے باوجود سوویت یونین، چین اور دوسرے سٹالنسٹ ممالک میں ہونے والی ترقی کو محنت کشوں اور نوجوانوں کے سامنے پیش کر کے منصوبہ بند اور سوشلسٹ معیشت کی منڈی کی سرمایہ دارانہ معیشت پر برتری اور اس سماجی افادیت کو ثابت کرنا پڑ رہا ہے۔

مارکسزم بنیادی طور پر تناظر کی سائنس ہے۔ واقعات کے جنم لینے کے بعد ان کا تجزیہ پیش کرنا مارکسی علم کی توہین ہوتی ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کی پیش گوئی سب سے پہلے اس کے بانیوں نے کی تھی۔ لینن نے مختلف تقاریر اور مضامین میں سوویت یونین کے انہدام کی وجوہات

(c) ketabton.com: The Digital Library

اور شرائط اس واقعے کے رونما ہونے سے 70 سال پہلے کر دی تھی۔

مثلاً جولائی 1921ء میں لینن نے کمیونسٹ انٹرنیشنل (تیسری انٹرنیشنل) کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ایک تقریر میں کہا ''برلن جرمنی کا دل ہے اور جرمنی یورپ کا دل ہے۔ اگر جرمنی میں سوشلسٹ انقلاب کامیاب نہیں ہوتا تو پھر سوویت یونین کا انہدام ناگزیر ہو جائے گا۔'' اسی طرح ٹراٹسکی کی بے شمار ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کی وجوہات اور عناصر تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ 1936ء میں لکھی گئی ٹراٹسکی کی شہرہ آفاق کتاب ''انقلاب سے غداری'' میں انقلاب کی طرح انقلاب کی زوال پذیری اور اس سے جنم لینے والے انہدام کو مارکسی سائنس کے حوالے سے ٹھوس دلائل کے ذریعے واضح کیا گیا تھا۔ اس کے 50 سال بعد جو واقعات رونما ہوئے یہ کتاب تقریباً ان کا ہو بہو مکمل سکرپٹ تھی۔ ٹیڈ گرانٹ نے 1943ء میں ایک وسیع تحریر ''ریاست کی مارکسی تھیوری'' میں بھی اس انہدام کا واضح تناظر پیش کیا تھا۔ اسی طرح ٹیڈ گرانٹ نے 1947ء میں چینی انقلاب کے فتح مند ہونے سے 2 سال قبل جو تناظر پیش کیا تھا چین میں اکتوبر 1949ء کے بعد ہونے والے واقعات نے اس کو درست ثابت کیا۔ جب کہ اس انقلاب کے لیڈر ماؤزے تنگ نے اگست 1949ء میں انقلابِ چین کے مقاصد اور جو تناظر پیش کیا تھا، کہ انقلاب کے بعد سو سال تک سرمایہ داری رہے گی، غلط ثابت ہوا اور لندن میں بیٹھے ہوئے ٹیڈ کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی کیونکہ جب پیکنگ، نان جنگ اور دوسرے شہروں میں سرخ فوج کے داخل ہوتے ہی صنعتی پرولتاریہ انقلاب میں داخل ہوا تو انہوں نے سامراجی اور قومی صنعتوں پر قبضے کر لیے اور ماؤ کو چین میں اپنے نظریات اور تناظر کے برعکس سرمایہ داری کا خاتمہ کرنا پڑ گیا تھا۔ اگر ہم چین میں سرمایہ داری کی بحالی اور اس سے ابھرنے والے بحران جو اب شدت اختیار کرتا جا رہا ہے کے بارے میں IMT کی دستاویزات اور تجزیوں کا جائزہ لیں تو ایک مرتبہ پھر جنم لینے والے واقعات ان کو تاریخ کی کسوٹی پر درست اور سچا ثابت کر رہے ہیں۔

لیکن جہاں سوویت یونین اور چین کے بارے میں مارکسسٹوں کے تناظر درست ثابت ہوئے ہیں وہاں عالمی سرمایہ داری کے بارے میں بھی ان کی پیش گوئیاں تاریخ نے سچ ثابت کی ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

2008ء میں ہونے والا سرمایہ داری کا بحران اس کی تاریخ کا سب سے بڑا کریش تھا۔اس کے بعد دنیا بھر میں جو سماجی تباہی آئی ہے اور آ رہی ہے اس کا تناظر کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے بیلجیئم میں ہونے والی انٹرنیشنل کی میٹنگ میں بہت ہی واضح انداز میں پیش کر دیا تھا۔ امریکہ، برطانیہ، یورپ اور دنیا بھر کے بڑے بڑے ناموں والی یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے ناموں والے معیشت دان اور پروفیسر حضرات سرمایہ داری کے اس تاریخی زوال کی نشاندہی نہیں کر سکے تھے۔ بلکہ ان کی اکثریت کے لیے یہ ایک حیران کن صدمہ تھا کہ جس نظام کو انہوں نے تاریخ کا اختتام قرار دیا تھا وہی نظام ان کے سامنے ان کی زندگیوں میں ہی دھڑام سے گرا اور منہدم ہو رہا ہے۔اس پسِ منظر میں اگر دیکھا جائے تو سرمایہ دارانہ نظام امریکہ اور یورپ جیسے اپنے عروج کے معاشروں میں ایک شدید تنزلی کا شکار ہے۔2008ء کے معاشی انہدام کے بعد کے پانچ سالوں میں بیروزگاری 1930ء کے عظیم بحران کے دور کی سطح تک پہنچ چکی ہے، نوجوان محنت کشوں کی اجرتوں میں کمی ہوئی ہے اور ان کے لیے تعلیم کے مواقع ختم ہو رہے ہیں۔مئی 2013ء میں یونان میں 15 سے 24 سال تک کے نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 64.2 فیصد تک پہنچ چکی تھی جو مارچ 2012ء میں 54.1 فیصد تھی۔اس سال مارچ میں اسپین میں نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 55.9 فیصد جبکہ اٹلی میں 38.4 فیصد تھی۔ مستقبل میں بھی بہتری کی کوئی امید نہیں اقوام متحدہ کے ادارے انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کی ایک رپورٹ کے مطابق آئندہ پانچ سالوں میں بھی نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح میں اضافہ ہو گا۔ترقی یافتہ ممالک میں وہ نوجوان جو نہ تو تعلیمی اداروں میں ہیں اور نہ روزگار پر ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی شرح 15.8 فیصد سے زیادہ ہے۔ یورپ میں وہ نوجوان جو نوکری کر رہے ہیں ان میں سے بھی 40.8 فیصد عارضی ٹھیکے پر کام کر رہے ہیں۔

دوسری جانب پسماندہ اور نام نہاد ''ترقی پذیر'' ممالک میں اس بحران کا حشر زیادہ بھیانک سماجی بربادی کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ 2008ء میں جب ''پرانے'' ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں یہ کریش آیا تو بہت سے سرمایہ دارانہ ماہرین نے یہ دلیل پیش کی کہ عالمی

(c) ketabton.com: The Digital Library

سرمایہ داری کو ''ابھرتی'' ہوئی معیشتیں، جن میں برازیل، روس، ہندوستان، چین اور جنوبی افریقہ کو شامل کیا جارہا تھا، اس کو سہارا دے کر مستحکم بنائیں گی۔ لیکن اس دوران ہم نے دیکھا کہ یہ تمام معیشتیں بھی بری طرح تنزلی کا شکار ہیں اور ان ملکوں کی بلند اور تیز شرحِ نمو ان ممالک میں موجود غربت میں بھی قطعاً کوئی کمی نہیں لارہی تھی اور وہ بھی اب تیزی سے گر گئی ہیں۔ ان تمام ممالک میں پیداوار، معاشی ترقی اور شرحِ نمو آدھی سے بھی کم رہ گئی ہیں۔

مارکسزم نے سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تناظر پیش کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام قومی معیشتوں سے نکل کر ایک عالمی معیشت میں منتقل ہو جائے گا۔ اس لیے حالیہ گلوبلائزیشن کوئی نئی چیز نہیں بلکہ 1914ء میں شاید اس سے زیادہ معاشی عالمگیریت جنم لے چکی تھی۔ ہم ایک عالمی معاشی اکائی میں رہ رہے ہیں۔ ایک عالمی منڈی ہے جس کا ایک کچل دینے والا جبر اس عالمی منڈی کے ہر سیاسی اور ریاستی یونٹ پر مسلط ہے۔ سرمایہ داری نظام میں رہتے ہوئے کوئی ملک، کوئی خطہ، کوئی سماج اس جبر، استحصال اور سامراجی لوٹ کھسوٹ سے بچ نہیں سکتا۔ 183 اجارہ داریاں دنیا کی 85 فیصد معیشت کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اس جکڑ کو سامراجی مالیاتی ادارے خصوصاً غریب ممالک کی معیشتوں کو اپنے قبضے میں لے کر مزید مضبوط کرتے ہیں۔ اس پسِ منظر میں اگر پاکستان کی معیشت کا جائزہ لیا جائے تو اس کی حالت زار پر خود اس پر حاکمیت کرنے والے چیخ و پکار کر رہے ہیں۔ اس ملک کی مجموعی پیداوار اور دولت کا تقریباً 70 فیصد صرف سامراجی قرضوں کے سود اور ان کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ فوجی اسلحے اور تباہی کے آلات پر صرف ہوتا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان دنیا کے سب سے زیادہ اسلحہ خریدنے والے 6 ممالک کی لسٹ میں آتے ہیں جبکہ صحت، تعلیم، نکاس، پانی اور دوسری سماجی ضروریات کی لسٹ میں دنیا کے آخری 6 ممالک میں آتے ہیں۔

یونیسف کے ایک سروے کے مطابق پاکستان میں غذائی قلت کا شکار 5 سال سے کم عمر 44 فیصد بچے کبھی ایک مکمل انسان نہیں بن پائیں گے یعنی ان کی "Stunted Growth" ہوئی ہے۔ یہ بچے بڑے ہو کر اپنی اگلی نسل جیسی قامت اختیار نہیں کر پائیں گے یعنی صرف پندرہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

سال بعد پاکستان کی آدھی آبادی کے قد اپنی نسل کے باقی افراد کی نسبت چھوٹے ہوں گے۔ ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 60 فیصد آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے اور تقریباً 21 فیصد غذائی ضروریات کے حصول میں قحط کا سامنا کر رہے ہیں۔ اسی بینک کی ایک اور رپورٹ کے مطابق 15 سال سے زائد عمر کے 50 فیصد افراد بیروزگار ہیں۔ بڑھتی ہوئی افراطِ زر مزید غربت کو جنم دے رہی ہے۔ ایشین ڈیویلپمنٹ بینک کے مطابق غذائی اجناس کی قیمتوں میں ہونے والا 10 فیصد اضافہ 2.2 فیصد یعنی 34 لاکھ مزید پاکستانیوں کو سطحِ غربت سے نیچے دھکیل دیتا ہے اور گزشتہ چند ماہ میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں 20 فیصد تک اضافہ ہوا ہے جس کے نتیجے میں 69 لاکھ لوگ غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ہر روز مزید 30 ہزار سے زائد افراد غربت کی لکیر سے نیچے گرتے ہیں۔

پاکستان میں 78 فی صد آبادی انتہائی غربت میں رہ رہی ہے، 82 فیصد غیر سائنسی علاج کروانے پر مجبور ہیں۔ 60 فی صد بچے سکول نہیں جا سکتے۔ ہر سال 5 لاکھ خواتین زچگی کے دوران طبی سہولیات کی عدم فراہمی کی وجہ سے ایک نئی زندگی کو جنم دیتے ہوئے اپنی ہی زندگانی کھو دیتی ہیں۔ ہر ایک ہزار افراد کے لیے ہسپتال میں 0.6 بستر ہیں۔ 52 فیصد آبادی کے پاس بیت الخلاء کی سہولت نہیں ہے۔ بجلی، پانی، ٹرانسپوٹ، ریلوے اور تمام دوسرے سماجی و صنعتی انفراسٹرکچر کے شعبے گل سڑ کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ قومی مسئلہ حل ہونے کے بجائے ایک خونریز پیچیدگی میں داخل ہو گیا ہے۔ جس سے انتشار شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ریاست میں مذہبی جنون شدت سے سرائیت کر چکا ہے، جس سے ریاست کا ہر ادارہ تعصب اور رجعتیت کا شکار ہے۔ جمہوریت یہاں صرف دولت والوں اور سامراج کے دلالوں کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے۔ یہ امیروں کے لیے ایک عیاشی، ایک کھلواڑ اور مزید دولت لوٹنے کا اوزار ہے جبکہ محنت کشوں کے لیے یہ محض ایک دھوکہ، ایک فریب ہے۔ جاگیرداری یہاں ایک مسخ شدہ شکل میں ہے۔ یہاں بیشتر بڑی جاگیریں بینکوں میں گروی رکھی جا چکی ہیں اور ان کے عوض حاصل کی جانے والی دولت سے اس نیم

(c) ketabton.com: The Digital Library

جاگیردارانہ، نیم سرمایہ دارانہ سماج کا حکمران طبقہ اپنی عیاشیوں اور بدکاریوں میں مشغول ہے۔ پاکستان کی کل معیشت میں سفید یا سرکاری معیشت کا حصہ 30 فی صد سے بھی کم ہے۔ 70 فی صد کالا دھن منشیات کے کاروبار، سمگلنگ، بدعنوانی اور دوسرے مجرمانہ ہتھکنڈوں سے حاصل ہوتا ہے۔ مذہبی دہشت گردی اس کی پیداوار اور اس کی محافظ بھی ہے۔ اس ریاست کے تمام اداروں میں کالے دھن کی سرائیت سے ریاست اندر سے کھوکھلی ہوچکی ہے اور یہ کالا دھن اس ریاست کے مختلف گروہوں کے درمیان اختیارات اور تصادموں کا باعث بن رہا ہے۔ سیاست میں اس کی سرائیت بھی اسی نوعیت کے نتائج کی حامل ہے اور اس سیاست کو کالا دھن خرید کر اس کو اپنے حجم اور جرائم میں اضافے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ کالی معیشت پاکستان میں 72.8 فی صد روزگار فراہم کرتی ہے۔ پاکستان کی سرکاری معیشت کی شرح نمو تقریباً 2 فی صد ہے جبکہ کالی معیشت 9 فیصد کی شرح سے نمو پا رہی ہے۔ لیکن یہ صنعتی اور پیداواری صنعتوں میں نہیں لگائی جاتی بلکہ سروسز کے شعبوں، تعمیرات، ہاؤسنگ اور ٹرانسپورٹ وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح تعلیم اور علاج کے شعبوں میں اس کالے دھن کی سرمایہ کاری بہت بڑی شرحِ منافع کے حصول کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

یہاں آنے والی ہر سیاسی یا فوجی حکومت اور ریاستی بیورکریسی اپنے تاریخی استرداد کی وجہ سے سامراجی گماشتگی کر رہی ہے۔ فوجی آمریت ہو یا سویلین جمہوریت اصل طاقت اور جبر جس کے نیچے یہ سماج سلگ رہا ہے وہ مالیاتی سرمائے کا ہے۔ جسکا پھر بڑا حصہ مجرمانہ کالے دھن پر مبنی ہے۔ لیکن جو معاشی پالیسیاں ہر حکومت بناتی ہے وہ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دوسرے سامراجی مالیاتی اداروں کے نسخوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ جس کا مقصد سامراجی اجارہ داریوں اور سرمایہ داری کے منافعوں میں تیز ترین اضافہ اور محنت کشوں کے روزگار اور زندگیوں کو مزید اذیت ناک بنانا ہی ہو سکتا ہے۔ مستقل ملازمتوں کو ختم کر کے ٹھیکیداری نظام کو رائج کرنا، نجکاری کے ذریعے بیروزگاری، لبرلائزیشن کے ذریعے اجارہ داریوں کو منافعوں اور دولت کی بلا روک رکاوٹ ترسیل، ڈی ریگولیشن کی پالیسی کے ذریعے بینکوں کو قرضے دینے اور مختلف سکیموں کے ذریعے انتہائی منافع بخش

(c) ketabton.com: The Digital Library

کاروبار کرنے کی کھلی چھوٹ جیسے نسخوں کے ذریعے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں کا حکمران طبقہ یہاں سرمایہ دارانہ یا قومی جمہوری انقلاب کا کوئی ایک فریضہ بھی مکمل نہیں کر سکا جس سے انتہائی جدید ٹیکنالوجی کے جرائم پسماندگی، غربت اور محرومی کے سمندر میں تضادات کو تیز سے تیز تر کر رہے ہیں۔ ان تضادات کے پھٹنے سے یہاں 1968-89ء کا انقلاب برپا ہوا تھا۔ ایک طرف تیز ترین صنعت کاری ہو رہی تھی اور دوسری جانب یہ صنعت کاری سماجی ترقی نہیں کر رہی تھی جس سے یہ انقلاب پھٹا تھا۔ ایک مارکسی قیادت اور پارٹی کے فقدان کی وجہ سے یہ انقلاب ایک سوشلسٹ فتح سے ہمکنار نہیں ہو سکا تھا۔ آج وہی تضادات کہیں زیادہ شدید اور اذیت ناک ہو چکے ہیں۔ قومی جمہوری انقلاب کے فرائض یہاں کا حکمران طبقہ پورے نہیں کر سکتا۔ سرمایہ داری میں یہ ممکن ہی نہیں۔ صرف بیروزگاری کی بڑھتی ہوئی شرح کو روکنے کے لئے ہر سال 13 لاکھ نئے روزگار پیدا کرنا ضروری ہیں، دیوالیہ پن سے بچنے کے لئے ہر سال پاکستان کی معیشت کو 7 سے 8 فیصد کی شرحِ نمو درکار ہے، جس کے لئے ہر سال ساڑھے تین کھرب روپے درکار ہیں۔ جو پاکستان کے GDP کے دوگنا سے بھی زیادہ ہے۔ پاکستان کا سرمایہ دارانہ نظام اتنا گل سڑ چکا ہے کہ یہ کسی روشن خیالی اور ترقی پسندی کی بجائے رجعتیت اور مذہبی جنون کو جنم بھی دے رہا ہے اور اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے اس مذہبی دہشت گردی کے ذریعے محنت کشوں کے خون سے ہولی بھی کھیل رہا ہے۔

جہاں معیشت اور سماج گل سڑ چکے ہیں وہاں ریاست، سیاست، صحافت، ثقافت، اخلاقیات اور ماحولیات بھی انتہائی بوسیدہ اور تعفن آمیز شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس صورت حال میں یہ نظام اس معاشرے کو تیزی سے بربریت کی جانب دھکیل رہا ہے۔ یہ نظام اس سماج کے جسم میں ایک ناسور بن گیا ہے جس کو ایک انقلابی جراحی سے ہی چیر کر باہر پھینکا جا سکتا ہے۔ تمام ادارے جس تنزلی اور خستگی کا شکار ہو چکے ہیں ان کا وجود یہاں کے سماج پر ایک بدبودار لاش کا بوجھ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کیفیت میں پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ کار نہیں ہے جس سے اس معاشرے کی لوٹی ہوئی دولت سامراجی اثاثوں اور حکمرانوں کی بیہودہ استحصالی

(c) ketabton.com: The Digital Library

رقوم کو ضبط کیا جاسکے گا۔ ملکیت کے رشتوں کو نجی اور انفرادی ملکیت سے نکال کر یکسر اشترا کی ملکیت میں دینے سے ہی اجتماعی ترقی ممکن ہے۔ ان میں صنعت وحرفت، زراعت اور تمام حاوی معیشت کے شعبے آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں پھر ایک انقلابی تحریک ابھرے گی۔ لیکن اس تحریک کی فتح اور کامیابی کے لیے ایک مارکسی لیننسٹ پارٹی درکار ہے۔ کیونکہ یہی پارٹی وہ اوزار ہوتی ہے جس کے ذریعے محنت کش طبقہ ایک فیصلہ کن فتح سے سرفراز ہوسکتا ہے۔ یہ پارٹی درحقیقت ریاست کے اندر ایک ریاست ہوتی ہے۔ جو انقلاب کے بعد مزدوروں کی سوشلسٹ ریاست بنتی ہے۔ لیکن ایک انقلابی پارٹی سب سے پہلے ایک نظریہ ہوتی ہے۔ یہ نظریہ صرف مارکسزم ہی ہے۔

آج دنیا بھر میں جہاں ایک عہد بدل رہا ہے۔ نئی تحریکیں پھوٹ رہی ہیں، وہاں مارکسزم کا بھی احیا ہو رہا ہے۔ اس کتاب کو چھاپنے کا مقصد اس نئی نسل کو مارکسزم کے ان نظریات سے روشناس کروانا ہے جس پر عبور حاصل کر کے ہی وہ کیڈر بن سکیں گے جو یہاں برپا ہونے والے سوشلسٹ انقلاب کی قیادت کر کے اس کو فتح یاب کریں گے۔

لال خان

لاہور، جون 2013ء

(c) ketabton.com: The Digital Library

مارکسی نظریات کی تصدیق

مارکس کے نظریات کی جتنی ضرورت اور مطابقت آج ہے، اتنی شاید کبھی بھی نہیں تھی۔ اس کا اظہار موجودہ عہد میں مارکسی نظریات کے لئے تڑپ، تجسس اور جستجو سے ہوتا ہے۔ مشکل سے کوئی ایک دن ہی ایسا ہوگا کہ جب مارکس کا تذکرہ نہ ہوتا ہو یا اس کا حوالہ نہ دیا جاتا ہو۔ خاص طور پر جب سرمایہ دارانہ بحران کا معاملہ زیر بحث ہو۔ اس وقت کہ جب سرمائے کے حکمت ساز کسی بھی سرمایہ دارانہ بحران کے امکان کو ہی مسترد کر رہے ہوتے ہیں اور جیسا کہ ماضی میں وہ ایک نئے عہد کی باتیں کرتے نہیں تھکتے تھے، اس دوران یہ مارکسسٹ ہی تھے جو کہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کے قوانین کے بارے میں اپنا نکتہ نگاہ پیش کر رہے تھے، قوانین جو کہ اس دوران کارفرما تھے بلکہ جن کی وجہ سے تضادات بھی پرورش پاتے چلے جا رہے تھے۔ حالت یہاں تک تو پہنچ چکی ہے کہ جریدے فنانشل ٹائمز کو ''سرمایہ دارانہ نظام کا بحران'' پر سلسلہ وار مضامین شائع کرنے پڑ گئے۔ لیکن یہ لوگ ابھی تک یہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بھی کوئی ''حدود وقیود'' ہو سکتی ہیں۔ سرمایہ داری کا یہ نامیاتی بحران ایک عمومی بحران سے قدرے مختلف ہے جو نظام کی مکمل متروکیت کی عکاسی کرتا ہے اور نہ صرف قومی ریاست بلکہ نجی ملکیت کی محدودیت کے خلاف

(c) ketabton.com: The Digital Library

پیداواری قوتوں کی بغاوت کا اظہار ہے۔ یہ بحران نظریات، اخلاقیات، مذہبی اقدار، سیاسی پارٹیوں اور انتظامی ڈھانچے کے بحران میں اپنا اظہار کر رہا ہے، دوسرے لفظوں میں طرز حکمرانی اور حکمرانی کے تمام اداروں کے بحران کی شکل میں۔ اس قسم کی کیفیت میں یہ صرف مارکسزم ہی ہے جس کے نظریات فروغ پا سکتے ہیں اور پا رہے ہیں۔ ہمارا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم اس وسیع عمل میں اپنا کردار ادا کریں اور اپنے قارئین کو ان بڑے واقعات کیلئے تیار کریں جو آنے والے وقت میں اپنا اظہار کرنے والے ہیں۔

موجودہ عہد میں مارکسزم کی افادیت

130 سال پہلے کارل مارکس کی وفات ہوئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم کیونکر ایک ایسے انسان کو یاد کرتے ہیں جو 1883ء میں فوت ہو گیا۔ بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی کی ابتدا میں اس وقت لیبر پارٹی کے برطانوی وزیر اعظم ہیرالڈ ولسن نے کہا تھا کہ ہمیں کسی طور بھی خود کو درپیش مسائل کے حل کیلئے لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں موجود قبر کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے جہاں کارل مارکس دفن ہے۔ کوئی احمق ہی ہو گا جو ہیرالڈ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرے گا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مذکورہ بالا قبرستان میں آپ کو پرانی ہڈیاں، خاک اور بوسیدہ ہو چکے کتبے کے علاوہ مل بھی کیا سکتا ہے! تاہم جب بھی ہم کارل مارکس کی آج کے وقت اور عہد کے ساتھ مطابقت اور وابستگی کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد کوئی قبرستان نہیں بلکہ نظریات ہوتے ہیں اور نظریات بھی ایسے کہ جو بار بار وقت اور سماج کی کسوٹی پر پرکھے جا چکے اور اپنی قدر و منزلت اور اہمیت قائم رکھے ہوئے ہیں، یہی نہیں بلکہ آج بھی یہ نظریات سرخروئی اور فتح مندی سے سرشار کیفیت میں دوبارہ سامنے آ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ مارکسزم کے دشمن بھی بادل نخواستہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ 2008ء کے معاشی انہدام نے واقعی یہ ثابت کر دیا کہ کچھ نہ کچھ ''متروک'' ہوا ہے لیکن یہ سرمایہ داری تھی نہ کہ کارل مارکس۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کئی دہائیوں سے معاشی ماہرین کے منہ یہ جگالیاں کرتے کرتے تھک چکے تھے کہ کارل مارکس کی معاشی انہدام کی پیش گوئیاں مکمل طور پر ناکام ثابت ہو چکی ہیں۔انہیں انیسویں صدی کے نظریات قرار دے کر فرسودہ کہا گیا اور وہ سب لوگ جو کہ مارکس کے ان نظریات کی علمبرداری کرنے میں لگے ہوئے تھے، وہ سب مایوس قنوطیت پسند اور بڑبولے سمجھے جا رہے تھے۔لیکن آج ان سب پر یہ بھید کھلا ہے کہ یہ تو سرمایہ دارانہ نظام کا دفاع اور نمائندگی کرنے والے لوگ ہی ہیں جو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکے جا رہے ہیں، جبکہ مارکس آج بھی سماجی حالات اور انسانی شعور میں کہیں نہ کہیں جاگزیں ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا، برطانوی وزیرِ اعظم گورڈن براؤن نے بڑے گھمنڈ سے کہا تھا کہ معاشی عروج وزوال (Boom & Bust Cycles) کا کھیل ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکا ہے۔ لیکن جلد ہی 2008ء کا انہدام سامنے آ گیا اور براؤن کو اپنے الفاظ نگلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یورو کا بحران یہ عیاں کرتا ہے کہ بورژوازی کو کچھ نہیں سمجھ آ رہی ہے کہ وہ یونان، اٹلی اور سپین کے مسئلے کا کیا اور کیسے حل نکالے! جس کی وجہ سے نہ صرف یورپ کی مشترکہ کرنسی بلکہ خود یورپی یونین کا وجود ہی داؤ پر لگ چکا ہے۔ یہ معاملہ بہت آسانی سے ایک عالمگیر سطح کے نئے زوال کا عمل انگیز بن سکتا ہے جو کہ 2008ء سے بھی زیادہ شدید اور گہرا ہوگا۔حالت یہ ہے کہ کئی بورژوا ماہرین بھی اسے قبول کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں جو نوشتہ دیوار کی مانند سامنے آ رہا ہے اور وہ یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اپنے اندر ہی ایسے بیج موجود ہیں جو اس کی تباہی کا موجب بنتے ہیں اور یہ بھی کہ یہ ایسا منتشر المزاج قسم کا نظام ہے جو کہ اپنے وقتاً فوقتاً اندرونی بحرانوں سے لوگوں کو کام سے محروم کرتا اور سیاسی وسماجی عدم استحکام کو فروغ دیتا ہے۔حالیہ بحران کے بارے یہی تصور تھا کہ یہ ''ناممکن'' ہو گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہی معاشی ماہرین کا یہ ایمان تھا کہ اگر منڈی کو آزادانہ اپنے طور طریقوں سے کام کرنے دیا جائے تو یہ جادوئی اثرات مرتب کرتے ہوئے نہ صرف سبھی درپیش مسائل کو حل کر دے گی بلکہ یہ طلب اور رسد کے مابین ایسا توازن پیدا کر لے گی کہ جسے معیاری منڈی کا نمایاں وصف سمجھا جاتا ہے۔ایسا ہو جانے کے بعد ان کو یقین تھا کہ اب دنیا میں دوبارہ کوئی

(c) ketabton.com: The Digital Library

1929ء جیسا عظیم زوال سامنے نہیں آئے گا۔

مارکس نے زائد پیداوار کے بحران کی جو پیش گوئی کی تھی، اسے بزعم خویش تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا گیا تھا اور وہ لوگ جو کہ مارکس کے ان خیالات کو درست سمجھتے تھے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام اندرونی اور ناقابل حل تضادات کا حامل ہوا کرتا ہے اور یوں اپنے اندر ہی اپنی تباہی کے بیج بوتا اور پھر اسے پروان چڑھاتا ہے، ایسے لوگوں کی اہانت وتضحیک کرنا ایک معمول بنا دیا گیا تھا۔ ان کے بقول سوویت روس کا انہدام واضح طور پر یہ ثابت کر چکا کہ کمیونزم ناکام ہو چکا ہے اور یہ کہ تاریخ اپنا یہ حتمی فیصلہ سنا چکی کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی اب نسل انسانی کیلئے واحد ممکنہ سماجی و معاشی نظام ہے۔ لیکن صرف بیس سالوں کے قلیل عرصے میں جو کہ انسانی سماج کی تقویم میں اتنا زیادہ وقت بھی نہیں ہے، تاریخ کا پہیہ ایک سو اسی درجے کے زاویے سے الٹ چل پڑا ہے۔ اب مارکس اور مارکسزم کے خلاف ہمہ وقت تنقید کرنے والے ایک بالکل ہی الگ نوعیت کا راگ الاپنا شروع ہو چکے ہیں۔ ''اچانک'' ہی کارل مارکس کے معاشی نظریات کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھا اور پڑھا جا رہا ہے۔ کئی معاشی ماہرین تو اس جستجو میں مارکس کی لکھتوں پر سر رکھ کے سو جاتے ہیں کہ وہ وجوہات تلاش کر سکیں کہ آخر غلطی کہاں ہے اور کیا غلط ہے!

بورژوا ماہرین کا نظریاتی ابہام

حالیہ بحران کے شروع ہو جانے کے بعد جولائی 2009ء میں جریدے ''اکانومسٹ'' نے لندن میں ایک کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد معیشت میں موجود خرابی کو سمجھنا تھا کہ یہ ہے کیا اور کہاں ہے۔ اس سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ معیشت کے نظریہ ساز معاشی فلسفے سے کس قدر بے بہرہ اور نابلد ہیں۔ نوبل انعام یافتہ ماہر معیشت پال کرگمین نے ایک عجیب اعتراف کیا اور کہا کہ ''پچھلے تیس سالوں کے دوران میکرو اکنامکس کی ترقی اپنے ''بہترین'' نتائج میں بالکل بے سود اور اپنے ''بدترین'' ادوار میں تباہ کن ہے۔'' یہ فیصلہ بورژوا طرز معیشت کے نظریات کی بالکل درست عکاسی کرتا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اب جبکہ واقعات نے کئی ایک بورژوا ماہرین کو اپنے سر کھجانے اورسوچنے پر مجبور کر دیا ہے، ایسے میں ہم دیکھتے ہیں کہ سبھی مضامین جو لکھے جا چکے ہیں، ان میں یہ بات طوعاً وکرہاً تسلیم کرنی پڑ رہی ہے کہ مارکس بہر حال صحیح تھا۔ یہاں تک کے دنیا میں عیسائیت کے مرکز ویٹی کن کے سرکاری جریدے "L'Osservatore Romano" نے 2009ء میں مارکس کی تعریف کی کہ اس نے آمدنیوں میں نابرابری کی درست تشخیص کی تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کیلئے خراج ہے کہ جس نے مذہب کو عام انسانوں کی افیون قرار دیا تھا۔ اس وقت مارکس کی کتاب ''سرمایہ'' جرمنی کی ''سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب'' ہے جبکہ جاپان میں بھی اسے شایان شان طریقے سے شائع کیا گیا ہے۔ USB بینک کے ایک سینئر معاشی تجزیہ نگار جارج میگنس نے ایک مضمون ''عالمی معیشت کو بچانے کیلئے کارل مارکس کو موقع دیا جائے'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا یہ بینک عالمی مالیاتی انتظام وانصرام کا اہم ستون سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دنیا بھر میں پچاس سے زائد ملکوں میں دفاتر ہیں اور یہ دو کھرب ڈالرز کے حامل اثاثوں کا مالک ہے۔ جریدے ''بلوم برگ ویو'' کیلئے لکھے گئے ایک اور مضمون میں میگنس نے لکھا ہے کہ ''آج کی عالمگیر معیشت بالکل انہی کیفیات سے مماثلت اور مشابہت رکھتی ہے جن کی پیش گوئی مارکس نے کی تھی۔'' اپنے اس مضمون کی ابتدا میں وہ مالیاتی کرب ناکیوں، ان کی وجہ سے ہونے والے احتجاجوں اور دنیا پر مرتب ہونے والے دیگر مضر اثرات کے اسباب وعوامل کو سمجھنے کی تگ ودو کرنے والے مالیاتی پالیسی سازوں کو تلقین کرتا ہے:

''آپ سب کو بہت عرصہ پہلے مر جانے والے ماہر معیشت کارل مارکس کا اچھی طرح مطالعہ کرنا ہوگا۔۔۔ مثال کے طور پر، ذرا مارکس کی اس پیش گوئی پر توجہ دیجیے کہ کیسے سرمائے اور محنت کے مابین موروثی تضاد اور تنازعہ اپنا اظہار کرے گا! جیسا کہ اس نے ''سرمایہ'' میں لکھا ہے کہ کمپنیوں کی منافعوں اور پیداواریت میں اضافے کیلئے دوڑ دھوپ فطری طور پر انہیں مجبور کردے گی کہ وہ کم سے کم محنت کشوں کو کام پہ رکھیں۔ جس کے نتیجے میں ایک صنعتی ریزرو فوج پیدا ہوتی چلی جائے گی جو کہ غریبوں اور بیروزگاروں پر مشتمل ہوگی۔ ایک طرف دولت کا ارتکاز ہوگا تو دوسری

(c) ketabton.com: The Digital Library

طرف اسی دوران محرومی کا بھی ارتکاز ہوتا چلا جائے گا۔‘‘

میگنس اپنی بات بڑھاتے ہوئے کہتا ہے:

’’مارکس کا نشاندہی کردہ یہ عمل اس وقت ہم ساری ترقی یافتہ دنیا میں وقوع پذیر ہوتا دیکھ رہے ہیں۔خاص طور پر امریکی کمپنیوں میں یہی کیفیت ہے۔جو اپنی لاگت کو کم کرنے اور روزگار دینے سے احتراز کررہی ہیں۔اس کے باعث امریکہ میں کارپوریٹ منافع ،مجموعی معاشی پیداوار کے ضمن میں پچھلے ساٹھ سالوں کی بلند ترین شرح کو پہنچ چکا ہے۔ جبکہ بیروزگاری کی شرح 9.1 فیصد کو چھو رہی ہے اور حقیقی اجرتیں منجمد ہیں۔‘‘

’’1920ء کی دہائی کے بعد سے اجرتوں میں نابرابری کی شرح بلند ترین سطح پر ہے۔ 2008ء سے پہلے آمدنی کے بارے تشویش کو آسان قرضوں جیسے طریقوں کے تحت دبا دیا گیا کہ جن کی وجہ سے ایک عام شہری کو بھی ایک بہتر معیارزندگی سے استفادہ ہوتا رہا لیکن اب یہ عمارت بھی دھڑام ہو چکی ہے۔‘‘

جریدے ’’وال سٹریٹ جرنل‘‘ نے معروف معیشت دان ڈاکٹر نورائیل روبینی جسے اس کے ہم عصر معیشت دان ’’ڈاکٹر ڈُوم‘‘(کالی زبان والا) بھی قرار دیتے ہیں کیونکہ موصوف نے 2008ء کے مالیاتی بحران کی پیش گوئی کی تھی ،کے ساتھ ایک انٹرویو کیا۔اس انٹرویو کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی دستیاب ہے جسے انتہائی توجہ اور احتیاط سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے تا کہ ہم یہ جان سکیں کہ سرمائے کہ انتہائی دوربین اور صاحب بصیرت حکمت ساز کیا سوچ رہے ہیں! روبینی کا ماننا ہے کہ قرضے کی زنجیر ٹوٹ چکی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام ایک پُر پیچ گھن چکر میں پھنس چکا ہے ۔ بڑھی ہوئی صلاحیت یعنی زائد پیداواریت، گرتی ہوئی صارفیت کی گرتی ہوئی طلب اور قرضوں کی بلند ترین شرح،ان سب نے مل کر سرمایہ کاروں کے اعتماد کو کمزور کر دیا ہے اور یہ سب کچھ اپنا اظہار سٹاک مارکیٹوں کے تیز انہدام،اثاثوں کی قیمتوں میں تیز گراوٹوں اور حقیقی معیشت کے انہدام کی شکل میں کرے گی۔تمام دوسرے معاشی ماہرین کی طرح سے روبینی کے پاس بھی جاری بحران سے بچنے کا کوئی حقیقی حل نہیں ہے۔سوائے اس احتیاطی تدبیر کے، کہ مرکزی

(c) ketabton.com: The Digital Library

بینک خودکو نگرانی کے ٹیکے لگوائیں تا کہ جاں بحق ہونے سے بچا جا سکے۔لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ محض احتیاطی ٹیکوں سے کچھ نہیں ہونے والا کیونکہ نہ تو کاروباراور نہ ہی حکومتیں کسی قسم کا تعاون کررہی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی حکومتیں کٹوتیوں کے پروگراموں پراس لئے عمل کررہی ہیں کہ وہ اپنی قرضوں میں جکڑی معیشتوں کو قابو میں لاسکیں ۔اس ضمن میں وہ مزید مانیٹری اقدامات متعارف کرائیں گے۔روبینی نے آخر میں جن الفاظ پر بات ختم کی ان سے بہت قنوطیت جھلک رہی تھی کہ'' کارل مارکس نے اس بات کو درست سمجھا تھا کہ'ایک مقام پرپہنچ کرسرمایہ دارانہ نظام خودکوتباہ وبرباد کرے گا'یعنی ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ منڈیاں کام کردکھائیں گی لیکن وہ کام ہی نہیں کررہی ہیں۔''

ایک سوتیس سال پہلے مرجانے اورزمین میں دفن ہوجانے والے کارل مارکس کا بھوت آج بھی بورژوازی کے سروں میں منڈلا رہاہے۔لیکن سوال تو یہ ہے کہ مارکسزم دراصل ہے کیا؟ مارکسزم کے سبھی پہلوؤں کوایک مضمون میں سمیٹنا تو ناممکن کام ہے ۔اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہاں ایک عمومی اورمخصوص احاطے میں نفس مضمون پیش کریں گے کہ جس کی بدولت ہمارے پڑھنے والوں میں ایساذوق وشوق پیدا ہوجائے کہ وہ خود مارکس کی تحریریں پڑھنے کی طرف راغب ہوسکیں۔مارکس کےنظریات بارے خود مارکس سے زیادہ کون بہتر بات کرسکتا ہے!

اگر عام لفظوں میں بیان کیا جائے تو مارکس کے نظریات کو تین شعبوں یا حصوں میں تقسیم کیاجاسکتاہے لیکن جوتقسیم ہوکربھی باہم مربوط رہتے ہیں۔لینن انہیں مارکسزم کے تین ذرائع اجزائے ترکیبی قراردیتاہے،انہیں عام طور پر مارکسی معیشت،جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کےعنوانات دیے گئے ہیں۔ان میں سے ہرایک جدلیاتی طور پر باہم منسلک ہےاورکسی ایک کوبھی باقیوں سے الگ یا کاٹ کرنہیں سمجھا جاسکتا ہے۔مارکسی نظریات کی مبادیات کوسمجھنے کیلئے ہم تجویز دیں گے کہ ہماری تحریک کی اولین بنیادی دستاویز جوکہ 1848ء کے یورپی انقلابات کے موقع پر لکھی گئی تھی،اسے پڑھا جائے۔ یہ تاریخ کی عظیم ترین اورانتہائی موثر کتابوں میں سے ایک ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کمیونسٹ مینی فیسٹو

ڈیڑھ سو سال پہلے شائع ہونے والی کتابوں کی بھاری اکثریت میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جو تاریخی اہمیت کی حامل ہو۔لیکن کمیونسٹ مینی فیسٹو کے حوالے سے سب سے حیران کن پہلو یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے ہمیں اس ساری کیفیت کی سمجھ بوجھ واضح ہو جاتی ہے کہ جو اس وقت ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔یہ سوچ کر بھی انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ 1847ء میں لکھی جانے والی ایک کتاب کس طرح اکیسویں صدی کی تصویر کشی کر رہی ہے۔یہ ایک غیر معمولی صورتحال بنتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ 1948ء میں چھپ کر سامنے آنے والا کمیونسٹ مینی فیسٹو اپنے وقت کی نسبت آج زیادہ سچا ہے۔یہاں ہم ایک مثال دیتے ہیں کہ جب مارکس اور اینگلز اسے لکھ رہے تھے تب ان بڑی بڑی عالمی اجارہ داریوں کا دور دور تک نام ونشان بھی نہیں تھا۔ایسی کیفیت میں انہوں نے وضاحت سے لکھا کہ کس طرح سے آزاد ادارے اور ان کی مقابلہ بازی ناگزیر طور پر سرمائے کے ارتکاز کو جنم دے گی اور ذرائع پیداوار اجارہ داریت کی زد میں آتے چلے جائیں گے۔سچی بات یہ ہے کہ جب منڈی کا دفاع کرنے والے اس معاملے میں مارکس پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اسے غلط قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت ہنسی آتی ہے کیونکہ یہ مارکس کی سب سے شاندار اور درست پیش گوئی تھی۔

1980ء کی دہائی میں یہ ایک فیشن بن چکا تھا کہ ''چھوٹا خوبصورت ہوتا ہے''(small is beautifull)۔یہاں یہ مقام نہیں کہ ہم چھوٹی، درمیانی یا بڑی درجے کی حامل کسی جمالیاتی بحث میں الجھیں۔یہ ہر کسی کا حق ہے کہ وہ اس بارے کوئی بھی رائے رکھے۔اس بحث میں پڑے بغیر یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دولت کے ارتکاز کے جس عمل کی پیش بینی مارکس نے کی تھی، وہ آج سب کے سامنے ہو رہا ہے، ہو ہی نہیں رہا بلکہ یہ پچھلے دس سالوں کے دوران بلند ترین سطح پر پہنچ چکا ہے۔امریکہ کے اندر تو یہ عمل بالکل واضح صورت میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں 2010ء میں خوش قسمت 500 کارپوریشنوں (Fortune 500) نے مجموعی قومی آمدنی کا 73.5 فیصد اپنے نام کر لیا۔اگر یہ 500 کمپنیاں باہم مل کر ایک الگ آزاد ملک بنائیں تو یہ دنیا

(c) ketabton.com: The Digital Library

کی دوسری بڑی معیشت ہوگی۔ 2011ء میں ان 500 کمپنیوں نے 824 ارب ڈالرز کا ریکارڈ منافع کمایا جو کہ 2010ء کے منافعوں سے 16 فیصد زیادہ تھا۔ عالمی پیمانے پر 2000 بڑی کمپنیاں اس وقت 32 ٹریلین ڈالرز نقد، 2.4 ٹریلین ڈالرز منافعوں، 138 ٹریلین ڈالرز کے اثاثوں اور 38 ٹریلین ڈالرز کی مارکیٹ ویلیو کی مالک ہیں۔ جبکہ 2010ء اور 2011ء کے دوران ان کے منافعوں میں 67 فیصد کا ہوشربا اضافہ ہوا ہے۔

جب مارکس اور اینگلز کمیونسٹ مینی فیسٹو لکھ رہے تھے تو اس وقت ان کے سامنے اس قسم کی واقعاتی شہادتیں موجود نہیں تھیں۔ اس کے برعکس، تب کا سرمایہ دارانہ نظام چھوٹے کاروباروں، آزادانہ تجارت اور مقابلے بازی پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ جبکہ آج ساری سرمایہ دار دنیا ایگزون، والمارٹ جیسی مٹھی بھر عالمی اجارہ داریوں کے تسلط میں ہے۔ ان بڑی بڑی کمپنیوں کے پاس جو دولت ہے وہ کئی ملکوں کے قومی بجٹوں سے کہیں زیادہ ہے۔ مینی فیسٹو کی پیش گوئیاں آج جتنی واضح اور شفاف ہیں اتنی تو شاید خود مارکس کی توقع نہ ہوگی۔ سرمائے کا دفاع کرنے والے کسی طور مارکس کو معاف نہیں کر سکتے کیونکہ اس وقت کہ جب سرمایہ دارانہ نظام اپنے شباب کی ابتدا پر تھا، مارکس نے اس کے زوال پذیر ہونے کی وجوہات کو بھانپ لیا تھا اور بیان بھی کر دیا تھا۔ دہائیوں تک تو سرمائے کے محافظین سرمائے کے ارتکاز اور چھوٹے کاروباروں کی جگہ بڑے کاروباروں کے لے لینے کے حوالے سے مارکس کی پیش گوئیوں کو سختی سے مسترد کرتے رہے۔ سرمایہ جس حد تک مرکزیت اور ارتکاز کر چکا ہے، اس کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سبھی جدید صنعتی ممالک میں بڑی کمپنیوں کا چھوٹی کمپنیوں کو کھا جانا ایک وبا کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ کئی معاملات میں تو اس قسم کے تسلط کیلئے بیہودہ اور گھٹیا طور طریقے بھی استعمال کئے گئے ہیں، جن میں اندرونی ساز باز، حصص کی قیمتوں بارے غلط بیانی سمیت کئی دوسری دھوکہ بازیاں اور چور بازاریاں شامل ہیں۔ اسی طرح Libor شرح سود کے حوالے سے برکلیز بینک سمیت کئی بڑے بینکوں کی جانب سے ہیر پھیر کے کئی سکینڈلز سامنے آئے ہیں۔ سرمائے کا یہ ارتکاز کسی طور پیداوار کی ترقی کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کسی بھی جگہ کہیں بھی یہ ارادہ اور نیت نہیں ہے کہ نئی صنعت میں اور مشینوں پر سرمایہ کاری کی جائے۔ اس

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے برعکس کئی کارخانے اور دفاتر بند کیئے گئے اور کیے جا رہے ہیں۔اس کے ساتھ ہی بڑی تعداد میں محنت کشوں کو روزگار سے فارغ کیا جا رہا ہے تاکہ پیداوار بڑھائے بغیر اپنی شرح منافع کو بڑھایا جاسکے۔ابھی حال ہی میں دو سوئس بینکوں نے ادغام کیا ہے جس کے فوری بعد ہی 13000 ملازمین کو کام سے باہر نکال دیا گیا۔

عالمگیریت اور نابرابری

اب آیئے ہم مارکس کی اگلی اہم پیش گوئی کی طرف بڑھتے ہیں جو اس نے 1847ء میں کی تھی۔مارکس نے وضاحت کی تھی:

''ایک عالمگیر منڈی کا ارتقا ہر قسم کی قومی انفرادیت اور حدود کو ناممکن بنا کے رکھ دیتا ہے، ہر ملک خواہ وہ کتنا بڑا اور کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، اب مکمل طور پر عالمی معیشت کی کلیت کے تابع فرمان ہو چکا ہے اور یہ عالمی معیشت ہی ہے جو ملکوں اور انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتی ہے۔''

یہ شاندار نظریاتی بصیرت خود ہی اپنا اظہار جس طرح کر رہی ہے، اس کیلئے کسی اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔اسی سے ہی مارکسی طریقہ کار کی ناقابل تردید برتری ثابت ہوتی ہے۔ گلوبلائزیشن (عالمگیریت) کو عمومی طور پر ایک حالیہ مظہر سمجھا اور قرار دیا جاتا ہے۔تاہم سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ایک واحد عالمی منڈی کی تخلیق کی پیش گوئی سالوں پہلے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں کر دی گئی تھی۔اس عالمی منڈی کا دنیا بھر پر بے رحمانہ غلبہ ہمارے آج کے عہد کی سب سے بڑی اور فیصلہ کن حقیقت ہے۔دوسری عالمی جنگ کے بعد محنت کی تقسیم کی عالمی پیمانے پر ہونے والی شدت نے مارکس کے تجزیے کی صداقت کو لیبارٹری کے تجربے کی سی سند عطا کر دی ہے۔اس کے باوجود کہ مارکس کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ غلط قرار دینے اور مسترد کرنے کی بھرپور اور مسلسل کوششیں کی گئیں۔اس بات کو جھٹلایا گیا کہ سرمائے کا ارتکاز ہو گا جس کے نتیجے میں طبقات میں تفریق اور امتیاز بڑھتا چلا جائے گا۔اس قسم کی ذہنی قلابازیاں دراصل بورژوازی کی خواب ہو چکی آرزوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں کہ شاید کمپنیوں کے آزادانہ کاروبار کے سنہرے دن دوبارہ لوٹ

(c) ketabton.com: The Digital Library

آئیں۔ ایسے ہی جیسے ایک نحیف بوڑھا آدمی اپنی گمشدہ جوانی کے دنوں کی یادوں میں غلطاں رہتا ہے۔ بدقسمتی سے سرمایہ دارانہ نظام کیلیئے رتی برابر امکان بھی موجود نہیں کہ اس کے عین شباب کے دن واپس لوٹ آئیں۔ بہت عرصے سے یہ نظام اپنی عمر عزیز کے آخری دن پورے کر چکا ہے، یعنی اجارہ دارانہ سرمایہ داری کے۔ بورژوازی کے تمام تر واویلے کے باوجود چھوٹے کاروباروں کے دن قصہء پارینہ ہو چکے ہیں۔ سبھی ملکوں کے اندر بڑی اجارہ داریوں نے بینکوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے ہوئے بورژوا ریاست کے ساتھ پنگا لے کر سارے سماج کی زندگی پر تسلط قائم کر لیا ہے۔ طبقات کے مابین تفریق اور تقسیم کسی رکاوٹ اور وقفے کے بغیر جاری و ساری ہے اور اس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

آیئے ہم امریکہ کا جائزہ لیتے ہیں جہاں کے چارسو امیر ترین خاندانوں کی مجموعی دولت سارے امریکہ کی 50 فیصد عام آبادی کی مجموعی دولت کے مساوی ہے۔ وال مارٹ کے 6 مالکان کی مجموعی دولت، 30 فیصد عام امریکیوں کی مجموعی آمدنی کے مساوی ہے۔ غریب ترین امریکیوں کا اپنے ملک کی دولت میں حصہ محض 2.5 فیصد ہے۔ امریکی آبادی کے امیر ترین ایک فیصد کا ملک کی مجموعی آمدنی میں حصہ جو 1976ء میں 17.6 فیصد تھا، وہ 2011ء میں بڑھ کر 37.1 فیصد ہو چکا ہے۔ پچھلے تیس سالوں کے دوران امیروں کی امارت اور غریبوں کی غربت کے مابین خلیج ناقابلِ تصور حدود کو پہنچی ہے۔ صنعتی ترقی یافتہ مغرب میں امیر ترین دس فیصد کی آمدنی وہاں کے غریب ترین دس فیصد کے مقابلے میں نو گنا زیادہ ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فرق، بہت بڑی خلیج ہے۔ معاشی طور پر آسودہ ملکوں کی تنظیم OECD کے جاری کردہ اعدادوشمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ میں سے شروع ہونے والی بے چینی اور مایوسی کی لہریں اب سویڈن، جرمنی اور ڈنمارک میں بھی پھیلتی جا رہی ہیں۔ یہ وہ ممالک ہیں جو روایتی طور پر کم نابرابری کے حامل چلے آ رہے تھے۔ بینکاروں کی مکروہ دولت اب ایک پبلک سکینڈل بن چکی ہے۔ لیکن یہ مظہر صرف مالیاتی اداروں تک ہی محدود نہیں ہے۔ بہت سی کمپنیوں کے ڈائریکٹروں کی اجرتیں، ان کمپنیوں کے کم ترین اجرت لینے والے محنت کشوں کے مقابلے میں 200 گنا زیادہ ہیں۔ اس بے حدو بے حساب

(c) ketabton.com: The Digital Library

تفریق نے مزاحمت کو مشتعل کرنے میں اہم کردار کیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کسی بھی وقت یہ اشتعال پھٹ کر ایک کے بعد دوسرے ملک کی سڑکوں پر آ کر اپنا اظہار کر سکتا ہے۔ بڑھتا ہوا یہ دباؤ اور تناؤ اپنا اظہار ہڑتالوں، مظاہروں، عام ہڑتالوں اور فسادات کی شکل میں کرتا چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح یہ اپنا اظہار حکومتوں اور مروجہ سیاسی پارٹیوں کے خلاف ووٹوں کی صورت میں بھی کر رہا ہے۔ اس کا ایک واضح مظاہرہ اٹلی میں ہونے والے حالیہ عام الیکشن میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جریدے ''ٹائم'' کے ایک سروے کے مطابق 54 فیصد امریکی ''آکوپائی وال سٹریٹ مومنٹ'' کی حمایت کرتے ہیں۔ 79 فیصد امریکی یہ مانتے ہیں کہ امیر اور غریب کے مابین تفاوت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ 71 فیصد امریکیوں کی رائے ہے کہ کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز کے خلاف مقدمات قائم ہونے چاہئیں۔ 68 فیصد امریکی چاہتے ہیں کہ امیروں پر زیادہ ٹیکس لگائے جائیں۔ رائے عامہ میں 27 فیصد نے ''ٹی پارٹی'' کی حمایت کی جبکہ 33 فیصد نے اسے مسترد کر دیا۔ بلاشبہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ امریکہ میں انقلاب تیار ہے، یہ بہت قبل از وقت بات ہوگی لیکن یہ بات واضح ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا بحران، آبادی کی ایک بڑی اکثریت میں تنقید اور غم وغصے کے رجحان کو فروغ دے رہا ہے۔ یہاں ایک ماحول بن چکا ہے جس کے اندر سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں ایسے سوالات جنم لے رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی سامنے نہیں آئے تھے۔

بیروزگاری کا طاعون

کمیونسٹ مینی فیسٹو میں کہا گیا تھا:

''یہاں یہ بات واضح طور پر مصدقہ ہو جاتی ہے کہ بورژوازی اب کسی طور بھی سماج کو چلانے کیلئے نا اہل ہو چکی ہے اور اب یہ سماج کے اوپر اپنے براجمان رہنے کے برتر قانون کے ہر جواز سے محروم ہو چکی ہے۔ یہ حکمرانی کے قابل نہیں ہے کیونکہ یہ اپنے غلام کو اس کی غلامی کی حالت میں بھی زندہ رہنے کی یقین دہانی کرانے کے بھی قابل نہیں رہی۔ یہ اس قابل بھی نہیں رہی کہ یہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

اپنے غلام کواتنا بھی کھلا سکے کہ وہ ڈوبنے سے بچ سکے، چہ جائیکہ اس کا غلام اسے کھلاتا پلاتا رہے۔انسانی سماج اس بورژوازی کے تحت زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔''

مارکس اوراینگلز کے مذکورہ بالا الفاظ آج حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔سماج کی سبھی پرتوں کے اندراب یہ احساس جاگزیں ہوتا چلا جارہا ہے کہ ہم سب کی زندگیاں ایسی طاقت کے غلبے تلے دب چکی ہیں جو ہم سب کے کنٹرول سے باہر ہے۔انسانی سماج ایک دہلا دینے والی بے یقینی اورخوف کی گرفت میں آچکا ہے۔سارے سماج میں عملی طور پر عدم تحفظ کا احساس ایک معمول بن چکا ہے۔وسیع پیمانے کی بیروزگاری جس کا ہم روز مشاہدہ اور تجربہ کررہے ہیں، مارکس کی پیش بینی سے بھی کہیں زیادہ بدتر سطح کو چھو رہی ہے۔مارکس نے بیروزگاروں کی ریزروفوج کا تذکرہ کیا تھا جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ محنت کشوں کے ایک حصے کو بیروزگار رکھا جاتا ہے جس کی بدولت سرمایہ داروں کواپنے کام کرنے والوں کی اجرتوں کوکم رکھنے میں سہولت مل رہی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں آج ہم جس قسم کی اور جس سطح کی بیروزگاری دیکھ رہے ہیں، وہ مارکس کی بیان کردہ ریزروفوج نہیں ہے جوکہ سرمایہ دارانہ نکتہ نظر سے فائدہ مند کردارادا کرتی ہے۔

امیر جس قدر امیر تر ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی محنت کرنے والوں کا خون نچوڑا جا چکا ہوتا ہے۔یہ سرمایہ داری کے عمومی بحران کی پیدا کردہ بیروزگاری نہیں کہ جس کے محنت کش عام طور پر ماضی سے عادی اورواقف بھی چلے آرہے ہیں۔ایسی عمومی بیروزگاری ایک بحران میں ابھرتی ہے اور بحران کے ختم ہونے کے بعد غائب ہوجاتی ہے۔موجودہ بیروزگاری ایک سٹرکچرل، مستقل اور نامیاتی بیروزگاری ہے جوکہ کسی عروج کے سامنے آجانے پر بھی قطعی ختم نہیں ہوتی۔یہ ایک بھاری پتھر بن جاتی ہے جو کہ پیداواری عمل کوسست کر کے رکھ دیتا ہے۔یہ ایک ایسی علامت ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ نظام ایک اندھے رستے پر گامزن ہو چکا ہے۔اقوام متحدہ کے اعدادوشمار کے مطابق 2008ء کے بحران سے دس سال پہلے دنیا میں بیروزگاروں کی تعداد 120 ملین تھی جبکہ 2009ء میں عالمی ادارہ برائے محنت کے مطابق یہ تعداد 198 ملین تک پہنچ چکی تھی جبکہ توقع ظاہر کی گئی کہ 2013ء تک یہ 202 ملین تک پہنچ جائے گی۔تاہم بیروزگاری بارے دیگر

(c) ketabton.com: The Digital Library

اعداد و شمار کی طرح یہ اعداد و شمار بھی حقیقی صورتحال سے گریز کی ایک سنجیدہ کوشش ہیں۔ اگر ہم اس فہرست میں ان خواتین و حضرات کو بھی شامل کریں جو چھوٹے موٹے روزگار کرنے پر مجبور ہیں تو دنیا بھر میں بیروزگاری یا نیم روزگار کا شکار انسانوں کی تعداد کسی طور بھی 1000 ملین سے کم نہیں ہوگی۔ معاشی بحالی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود معاشی ترقی کے سابقہ پاور ہاؤس جرمنی میں معاشی ترقی کی شرح تقریباً صفر تک آ گئی ہے۔ یہی حال فرانس کا ہے جبکہ جاپان کی معیشت بھی ٹھہراؤ کا شکار چلی آ رہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں خاندانوں کی محرومی اور بے بسی جہاں ایک بہت بڑا مسئلہ اور المیہ ہے وہیں معاشی نکتہ نظر سے یہ کیفیت انتہائی وسیع پیمانے پر ایک بہت بڑے پیداواری نقصان اور ضیاع کا بھی اظہار ہے۔ لیبر لیڈروں کی ماضی کی توقعات کے برعکس، وسیع پیمانے پر بیروزگاری واپس آ چکی ہے اور یہ ساری دنیا میں پھیلتی چلی جا رہی ہے اور ایک قاتل کینسر کی طرح سماج میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کا بحران براہ راست نوجوانوں کو اپنے خونی جبڑوں میں جکڑے جا رہا ہے۔ ہر ملک میں نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح بہت زیادہ ہے اور یہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ برطانیہ میں طالب علموں کے احتجاج اور نوجوانوں کی سرکشی، سپین میں انڈگناڈوس تحریک، یونان میں سکولوں پر قبضوں، یہاں تک کہ تیونس اور مصر کی انقلابی تحریکوں کے پیچھے بھی یہی بیروزگاری نمایاں عنصر تھی جہاں تقریباً 75 فیصد نوجوان بیروزگاری کا شکار ہیں۔ یورپ میں بھی بیروزگاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت سپین کے اعداد و شمار کے مطابق 27 فیصد بیروزگاری ہے۔ جبکہ نوجوانوں میں یہ شرح خطرناک حد تک 55 فیصد ہے۔ یونان میں نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 62 فیصد سے کسی طور کم نہیں ہے۔ ہر تین میں سے دو نوجوان بیروزگار ہیں۔ نوجوانوں کی ایک پوری نسل کو منافع کی کالی دیوی کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ وہ جو یہ سمجھتے تھے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھا مستقبل بنا لیں گے ،ان کو پتہ چل رہا ہے کہ یہ راستہ بھی روکا جا رہا ہے۔ برطانیہ میں جہاں اعلیٰ تعلیم مفت ہوا کرتی تھی، وہاں اب نوجوانوں کو یہ پتہ چل چکا ہے کہ اعلیٰ ہنر سیکھنے کیلئے اب انہیں قرضے لے کر پڑھنا ہوگا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

دوسری طرف وہ محنت کش جو ریٹائرمنٹ کو پہنچنے والے ہیں ان کو یہ پتہ چل رہا ہے کہ انہیں آگے بھی کام کرنا پڑے گا، یوں انہیں اپنی پنشنوں کیلئے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے گی جس سے وہ بڑھاپے کا وقت غربت اور تنگی میں گزارنے پر مجبور کردیے جائیں گے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نئی اور پرانی نسل کو درپیش اذیتوں کے ساتھ عام لوگوں کی بھاری اکثریت کو آج زندگی بھر کیلئے عدم تحفظ کے احساس تلے دب کر جینے پر مجبور کردیا گیا ہے۔قدیم بورژوازی کی خاندان اور اخلاقیات بارے اقدار کی منافقت ہر طرف اور ہر ایک پر عیاں ہو چکی ہے۔ بیروزگاری کا طاعون، بے گھری، اعصاب شکن قرضے اور انتہاؤں کو پہنچی ہوئی سماجی نابرابری نے ایک پوری نسل کو ایک ایسی اتھاہ بیزاری میں دھکیل دیا ہے کہ خاندان کا تصور ہی مجروح ہو کے رہ گیا ہے۔اس صورتحال نے ایک ایسی مہیب سماجیات پیدا کر دی ہے کہ جو ایک منظّم غربت، بے یقینی، خود اذیتی اور مایوسی کے عفریت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

زائد پیداوار کا بحران

قدیم یونانی دیو مالائی کہانیوں میں ہمیں ایک کردار ''پروکرسٹس'' کے نام سے ملتا ہے، جس کی ایک عجیب وغریب عادت تھی کہ وہ اپنے گھر آنے والے مہمانوں کے بازو، سر اور ٹانگیں کاٹ لیا کرتا تھا جن کے وجود اس کے مخصوص بستر سے بڑھے ہوتے تھے۔آج کل سرمایہ دارانہ نظام بھی ''پروکرسٹس'' کا بستر بنا ہوا ہے۔بورژوازی، ذرائع پیداوار کو منظّم طریقے سے تباہ و برباد کر رہی ہے تا کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی تنگ حدود میں فٹ رہیں اور تجاوز نہ کریں۔یہ معاشی غنڈہ گردی، وسیع پیمانے کی ''کاٹ ڈالو اور جلا ڈالو'' جیسی بدمعاشی سے مماثلت رکھتی ہے۔جارج سوروس اس کیفیت کو ایک ایسی گیند قرار دیتا ہے کہ جسے بلند و بالا عمارتوں کو گرانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہاں صرف عمارتیں ہی نہیں ڈھائی جا رہی ہیں، یہاں تو پوری کی پوری معیشتیں اور ریاستوں کی ریاستیں برباد کی جا رہی ہیں۔

آج کا مقبول ترین نعرہ ''کٹوتیاں'' اور ''معیارِ زندگی میں گراوٹ'' ہے۔ہر ایک ملک میں بورژوازی نے ایک ہی جنگی طبل بجایا ہوا ہے کہ ''ہمیں لازماً سرکاری اخراجات میں کٹوتیاں کرنی

(c) ketabton.com: The Digital Library

چاہئیں۔'' سرمایہ دار دنیا کے ہر ملک میں، چاہے وہاں دائیں بازو کی حکومت ہے یا پھر ''بائیں بازو'' کی، حقیقت میں سبھی اسی ایک پالیسی کو ہی اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ کسی بھی ایک یا دو مخصوص سیاستدانوں کی خواہش یا نا اہلی کا نتیجہ نہیں ہے نہ ہی کسی کی غفلت یا بدعنوانی اس کے پیچھے کارفرما ہے (بلاشبہ کئی بلکہ بہت سے اس قسم کے نانہجار بھی موجود ہیں) بلکہ یہ سارا انتشار اور خلفشار دراصل اس اندھے پن کا براہِ راست اور مجموعی اظہار ہے جس کا سرمایہ دارانہ نظام شکار ہو چکا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنی حدود کو پہنچ رہا ہے اور یہ ماضی کی طرح پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ گوئٹے کے الفاظ میں اس نے ایسی قوتیں تخلیق کر دی ہیں جو کہ اب خود اس کے کنٹرول سے بھی باہر ہو چکی ہیں ۔لیکن ریاستی اخراجات کم کرنے سے یہ مسلسل طلب میں کمی بھی پیدا کر رہے ہیں اور یوں منڈی کو ہی کاٹتے چلے جا رہے ہیں اور یہ سب ایک ایسے وقت ایک ایسی کیفیت میں ہو رہا ہے کہ جب بورژوا معاشی ماہرین یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ انہیں اس وقت عالمی سطح پر زائد پیداوار (زائد صلاحیت) کا سنجیدہ بحران درپیش ہے۔ آیئے یہاں ہم ایک شعبے آٹوموبائل کا ہی جائزہ لیتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی شعبہ ہے کیونکہ اس سے مزید کئی شعبے وابستہ اور منسلک ہیں۔ جن میں سٹیل، پلاسٹک، کیمیکلز اور الیکٹرونکس شامل ہیں۔ اس شعبے کی عالمگیر رسائی کی صلاحیت لگ بھگ 30 فیصد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فورڈ، جنرل موٹرز، فی ایٹ، رینالٹ، ٹویوٹا اور دوسرے ادارے ایک ہی دن کے نوٹس پر اپنے ایک تہائی کارخانے بند اور ایک تہائی ورک فورس کو فارغ کر سکتے ہیں لیکن ایسا کرنے کے باوجود بھی یہ سب ادارے مطلوبہ شرح منافع پر اپنی پیدا کردہ گاڑیوں کو نہیں بیچ سکیں گے۔ ایسی ہی کیفیت دوسرے شعبوں کی بھی ہے۔ جب تک اس بڑھی ہوئی صلاحیت کے مسئلے کا حل تلاش نہیں کر لیا جاتا، موجودہ بحران کسی طور ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ سرمایہ داروں کو درپیش پریشانی کو آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگر یورپ اور امریکہ خریداری نہیں کریں گے تو چین پیداوار جاری نہیں رکھ سکے گا اور اگر چین اپنی پہلی والی پیداواریت کو برقرار نہیں رکھتا تو برازیل، ارجنٹائن اور آسٹریلیا جیسے ممالک اپنے خام مال کی برآمدات جاری

(c) ketabton.com: The Digital Library

نہیں رکھ سکیں گے۔ساری دنیا آپس میں اتنی جُڑی ہوئی ہے کہ کسی کو کسی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔یورو کا بحران امریکی معیشت پر اثرات مرتب کرے گا جو کہ خود ایک کمزور حالت میں ہے اور اگر امریکہ متاثر ہوتا ہے تو یہ ساری عالمی معیشت کو جھنجوڑ کے رکھ دے گا۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''گلوبلائزیشن'' اب سرمایہ دارانہ نظام کے عالمگیر بحران کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

بیگانگی

ایک انتہائی حیران کن بصیرت کے ساتھ کمیونسٹ مینی فیسٹو کے مصنفّین ان حالات کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں جن کا آج دنیا کے ہر ایک ملک کے محنت کشوں کو سامنا ہے:

''مشینری کے بڑھتے ہوئے استعمال اور محنت کی تقسیم کار کی وجہ سے پرولتاریہ کا کام اپنے انفرادی کردار سے محروم کر دیا جاتا ہے۔جس کا نتیجہ کام کے ساتھ، کام کرنے والے کی رغبت کے خاتمے کی صورت میں نکلتا ہے۔وہ مشین ہی کا ایک پرزہ بن کے رہ جاتا ہے۔یہ ایک سب سے سادہ، سب سے بیزار کن اور انتہائی آسانی سے میسر آجانے والا رویہ ہوتا ہے جو اسے مل جاتا ہے۔ تاہم کام کرنے والے کی لاگت محدود ہوتی ہے، اور یہ صرف اتنی ہی ہوتی ہے کہ جس کے بل بوتے پر وہ بطور مزدور زندہ رہ سکے اور اپنی نسل کو برقرار رکھ سکے۔لیکن ایک تیار شدہ جنس اور محنت کی قیمت، پیداوار کی لاگت کے مساوی ہوتی ہے۔توازن کے اعتبار سے، کام کی شدت کے دباؤ میں جتنا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اتنی ہی اجرت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ایسے ہی توازن میں مشینری اور محنت کی تقسیم میں اضافہ ہونے سے، اسی تناسب سے کام کرنے والے کے دباؤ میں بھی اضافہ ہوتا ہے، چاہے یہ اوقات کار میں اضافے کی صورت میں ہو، ایک دیے گئے وقت میں زیادہ کام کرنے کی شکل میں ہو یا پھر مشینری کی رفتار بڑھانے جیسی دوسری شکلوں میں ہو۔''

آج امریکہ جیسے سب سے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک کی بالکل ویسی ہی کیفیت ہے جیسی مارکس کے دور میں برطانیہ کی ہوا کرتی تھی۔چنانچہ ہم امریکہ میں سرمایہ دارانہ نظام کے سبھی عمومی

(c) ketabton.com: The Digital Library

خدوخال، صاف شفاف حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔ پچھلے تیس سالوں کے دوران امریکہ میں کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز کی تنخواہوں میں 725 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ اسی عرصے میں محنت کشوں کی اجرتوں میں صرف 5.7 فیصد اضافہ ہوا۔ یہ چیف ایگزیکٹوز اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے مقابلے میں 244 گنا زیادہ تنخواہ لے رہے ہیں۔ وفاق کی سطح پر اس وقت کم از کم اجرت 7.25 ڈالرز فی گھنٹہ ہے۔ اکنامک پالیسی ریسرچ کے مرکز کے مطابق اگر کم از کم اجرت کو، محنت کش کی پیداوار سے منسلک رکھا جاتا تو یہ 2012ء میں بڑھ کر 21.72 ڈالرز فی گھنٹہ تک بڑھ چکی ہوتی۔ اگر افراطِ زر کو سامنے رکھا جائے تو اوسطاً ایک مرد محنت کش امریکی کی اجرت حقیقت میں 1968ء میں ملنے والی اجرت سے بھی کم ہے۔ اس اعتبار سے 2008ء سے پہلے کا سارا عروج (Boom) دراصل محنت کشوں کی قیمت پر ہی کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔

اس وقت جبکہ لاکھوں انسانوں کو جبری طور پر ایک ایسی زندگی میں دھکیل دیا گیا ہے جہاں وہ کچھ نہ کر سکنے کے جبر مسلسل کی زد میں آچکے ہیں، وہیں لاکھوں انسانوں کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ دو دو، یہاں تک کہ تین ملازمتیں کر کے زندہ رہنے کی تگ ودو میں لگے رہیں۔ لوگ اکثر ہفتہ وار ساٹھ گھنٹے اور کہیں اس سے بھی زیادہ، کام کر رہے ہیں اور اس اوور ٹائم کا انہیں کوئی اجرتی فائدہ بھی نہیں دیا جاتا۔ 85.8 فیصد مرد جبکہ 66.5 فیصد خواتین چالیس گھنٹہ فی ہفتہ سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ عالمی ادارہ برائے محنت کے مطابق ''امریکی محنت کش، جاپانی محنت کشوں کے مقابلے میں 137 گھنٹے، برطانوی محنت کشوں کے مقابلے میں 269 گھنٹے اور فرانسیسی محنت کشوں کے مقابلے میں 499 گھنٹے سالانہ زیادہ کام کرتے ہیں۔''

امریکی بیورو برائے لیبر اقتصادیات کے اعداد وشمار کے مطابق:

''1950ء کے بعد سے امریکی محنت کش کی اوسط پیداواریت میں 400 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے بات یوں بنتی ہے کہ ویسا ہی معیارِ زندگی حاصل کرنے کیلئے ایک محنت کش کو 1950ء کے مقابلے میں ایک چوتھائی کام کرنا چاہیے یعنی 11 گھنٹے فی ہفتہ یا پھر معیارِ زندگی بھی چار گنا بڑھنا چاہیے۔ اس کے برعکس ہوا یہ ہے کہ اکثریتی محنت کشوں کا معیارِ زندگی ڈرامائی

(c) ketabton.com: The Digital Library

طور پر گر چکا ہے ۔جبکہ کام سے وابستہ ذہنی تناؤ، کام کے دوران زخمی ہو جانے یا بیمار ہو جانے کی شرح میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ڈپریشن، خودکشیوں، طلاقوں، گھریلو تشدد، قتل عام سمیت کئی دوسری سماجی بیماریاں ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ایسی ہی صورتحال برطانیہ کے اندر بھی موجود ہے جہاں تھیچر کے دورِ حکومت میں 2.5 ملین صنعتی روزگار ختم کر دیے گئے۔اس کے باوجود بھی یہاں 1979ء کی سطح کی شرحِ پیداوار قائم ہے ۔یہ ہدف نئی مشینری لگانے سے نہیں بلکہ محنت کشوں کے بڑھتے ہوئے استحصال کی بدولت ممکن کیا گیا ہے۔1995ء میں برطانوی ڈائریکٹر جنرل آف ہیلتھ کینیتھ کیلمین نے انتباہ کیا تھا کہ مستقل روزگار کے ختم ہو جانے کے بعد ذہنی تناؤ سے جڑی بیماریاں وبا کی طرح تیزی سے پھیل رہی ہیں۔''

طبقاتی جدوجہد

مارکس اور اینگلز نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں قرار دیا تھا کہ معلوم انسانی تاریخ میں ایک مسلسل اور متواتر عنصر یہ چلا آ رہا ہے کہ سماجی ترقی ،طبقاتی جدوجہد ہی کی مرہونِ منت ہوا کرتی ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کے تحت اس کا عظیم اور سادہ اظہار، سماج کے دو بڑے متحارب طبقوں کی واضح تقسیم سے ہوتا ہے۔پچھلے دو سو سالوں کی صنعت اور ٹیکنالوجی کی شاندار ترقی کی بدولت، معاشی طاقت قلیل ہاتھوں میں مرکوز و مرتکز ہوتی چلی گئی ہے۔کمیونسٹ مینی فیسٹو کے مقبول ترین فقروں میں سے ایک یہ ہے کہ ''اب تک کی انسانی سماج کی ساری تاریخ، طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔'' بہت لمبے عرصے تک ، بہت سوں کے دماغوں میں یہ سوچ پروان پاتی چلی جا رہی تھی کہ یہ تصور ہی متروک ہو چکا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے طویل سرمایہ دارانہ پھیلاؤ کی وجہ سے جدید صنعتی معیشتوں میں روزگار کی کوئی قلت نہ تھی، معیارِ زندگی اور اصلاحات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا، فلاحی ریاستیں بن رہی تھیں، ایسے میں لگ بھی ایسے رہا تھا کہ طبقاتی کشمکش ماضی ہی کی کوئی چیز ہو گی۔ مارکس نے پیش گوئی کی تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی لامحالہ سرمائے کے ارتکاز کا باعث بنے گی، ایک طرف دولت کے بے تحاشا اجتماع تو دوسری جانب یہ سماج کے دوسرے حصے میں

(c) ketabton.com: The Digital Library

غربت ،محرومی اورنا قابل برداشت مشقت کے ارتکاز کا بھی وسیلہ بنے گی ۔کئی دہائیوں سے بورژوا معاشی ماہرین اور یونیورسٹیوں کے سماجیاتی ماہرین اس تصور کونا کارہ قرار دیتے اور یہ اصرار کرتے چلے آرہے تھے کہ سماج روز بروز اور زیادہ سے زیادہ یک طبقاتی ہوتا چلا جارہا ہے اوراب ہر کوئی مڈل کلاس بنتا چلا جارہا ہے۔لیکن اب یہ سبھی دعوے نقش برآب ہو چکے ہیں۔بورژوا سماجیات دانوں کی یہ دلیل کہ محنت کش طبقہ اب وجود ہی نہیں رکھتا،اب ان کا منہ چڑارہی ہے۔پچھلے کچھ عرصے کے دوران کام کرنے والے لوگوں کی اہم پرتیں جو پہلے خود کو مڈل کلاس تصور کرتی تھیں اب صنعتی مزدوروں کی سطح پرآ چکی ہیں۔اساتذہ، سرکاری ملازمین، بینکوں کے ملازمین اور کئی دوسرے کام کرنے والے تواتر سے محنت کش طبقے کی صفوں میں شامل ہوتے چلے جارہے ہیں۔انہی میں سے کچھ تو ولولہ انگیز جدوجہد کرنے والے بھی بن رہے ہیں۔یہ قدیم منطق کہ ہر کوئی ترقی کرسکتا ہے اور یہ کہ ہم سب مڈل کلاس ہیں، واقعات وحالات کے ہاتھوں یکسر مسترد ہو چکی ہے۔ برطانیہ امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں پچھلے بیس تیس سالوں میں معاملات الٹے چلنے شروع ہو گئے ہیں۔مڈل کلاس لوگ اس سوچ کے عادی ہو چکے تھے کہ زندگی کا نظم ونسق مختلف مرحلوں میں چلتا ہے اور ہرا گلا مرحلہ، پچھلے سے بہتر ہوتا ہے۔اب کہیں بھی یہ صورتحال نہیں رہی۔محفوظ روزگار ایک خواب بن چکا ہے۔قدیمی چلے آرہے کاروبار اور پیشے اب غائب ہونا شروع ہو چکے ہیں اور طویل عرصے کی مستقل ملازمتیں اب ماضی کی یادیں بنتی جارہی ہیں۔ترقی کے زینے اکھڑ چکے ہیں اور بہت سے لوگوں کیلئے مڈل کلاس طرزِ زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔زیادہ سے زیادہ لوگوں کواب روزانہ کی بنیاد پر زندہ رہنا پڑ رہا ہے اوران کو مستقبل بارے کوئی پتہ نہیں کہ یہ کیسا ہوگا؟اگر لوگوں کے پاس کوئی دولت ہے تو وہ ان کے مکانوں کی شکل میں ہے لیکن معیشت کی تنگ حالی کی کیفیت میں کئی ملکوں میں مکانوں کی قیمتیں گر چکی ہیں اور جو شاید کئی سالوں تک ایسے ہی منجمد رہیں۔جائیداد کی ملکیت پر مبنی جمہوریت کا تصور ایک سراب بن چکا ہے۔ایک آرام دہ ریٹائرمنٹ کیلئے مددگار مالی معاونت کا حامل اثاثہ بننے کی بجائے، گھر کی ملکیت ایک بھاری بوجھ بن چکی ہے۔آپ چاہے روزگار پر ہیں یا نہیں ہیں لیکن آپ کو گھر کیلئے لیا ہوا قرضہ تو بہرحال واپس کرنا ہی کرنا ہے۔بہت سے لوگوں کو تو لینے کے دینے پڑ گئے ہیں اوران

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے قرضے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ادا ہونا ہی ناممکن ہو گیا ہے۔ایک ایسی نسل پیدا ہو چکی ہے اور جس میں آئے روز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے کہ جو قرضوں کی غلامی میں جکڑی جا چکی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک تباہ کن سفا کی ہے۔تاہم بڑے پیانے پر مراعات یافتہ محنت کشوں کے معیارِ زندگی میں گراوٹ انہیں روائتی محنت کش طبقے یعنی صنعتی مزدوروں کی سطح پر لے آئی ہے جس کی وجہ سے رجعت کا سماجی مواد بہت کم رہ گیا ہے۔ابھی حالیہ عوامی تحریکوں میں سماج کے وہ حصے بھی شامل ہیں جنہوں نے پہلے کبھی سوچا تک نہیں ہوگا کہ وہ ہڑتالیں مظاہرے کریں گے یا یہاں تک کہ کسی یونین کا حصہ بنیں گے،ان میں ٹیچر اور سول سرونٹس بھی شامل ہیں حتیٰ کہ انہوں نے حالیہ طبقاتی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا۔

خیال پرستی اور مادہ پرستی

آئیڈیلزم یا خیال پرستی کا طریقہ کار اس بات سے متعلق ہوتا ہے کہ لوگ کس طرح سے سوچتے ہیں اور اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں۔لیکن مارکس نے وضاحت کی ہے کہ خیالات آسمانوں سے نہیں ٹپکتے بلکہ اس کی بہ نسبت،کم و بیش،درست طور پر معروضی صورتحال،سماجی دباؤ اور ان تضادات کا اظہار ہوتے ہیں جو مردوزن کے اختیار اور بس سے باہر ہوتے ہیں۔لیکن تاریخ اپنا اظہار ''عظیم'' انسانوں،بادشاہوں،سیاستدانوں یا فلسفیوں کی آزاد فکر یا شعوری خواہشات کے تحت نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس،سماج کی ترقی کا دارومدار اس کے ذرائع پیداوار کی ترقی پر ہوتا ہے۔سرمایہ داری میں یہ ترقی شعوری منصوبہ بندی کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ مردوزن کی محنت شاقہ کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔

مارکس نے سوشلزم کو ٹھوس نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا۔تاریخ کے سائنسی ادراک کی بنیاد،کسی طور پانی میں تیرنے والے نقوش،مسخ شدہ تصورات اور مردوزن کے ذہنوں میں موجود مافوق الفطرت توہمات پر نہیں بلکہ حقیقی سماجی تعلقات پر قائم ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کے ایک مخصوص مرحلے پر طرزِ پیداوار کی سیاسی اور سماجی عوامل کے ساتھ باہمی تعلقات بارے درست آگہی سے ہی اس کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔اسی کو ہی مختصراً تاریخی مادیت کے تجزیے کا طریق کار کہا

(c) ketabton.com: The Digital Library

جاتا ہے۔بعض لوگوں کو اس نظریے سے تکلیف ہوگی کہ اس سے تو تاریخی عمل میں موجود سر برآوردہ شخصیات کے کردار کی نفی ہوتی ہے۔اسی انداز میں ہی کلیسا اور اس کے فلسفیانہ معذرت خواہان، گلیلیو کے اس دعوے پر سخت ناراض ہوئے تھے کہ سورج زمین کے گرد نہیں بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔بعدازاں ایسے ہی لوگ تھے جنہوں نے ڈارون پر حملے شروع کر دیے تھے جب اس نے یہ کہا تھا کہ انسان کسی دیوتا کی خصوصی پیداوار نہیں بلکہ قدرتی انتخاب کی پیداوار ہے۔

تاہم مارکسزم کسی طور بھی تاریخ میں داخلی عنصر اور سماجی ترقی میں انسانوں کی شعوری فعالیت کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا۔مرد وزن اپنی تاریخ خود بنایا کرتے ہیں۔لیکن ایسا وہ اپنی آزادانہ خواہش اور شعوری ارادے کے تحت نہیں کرتے۔مارکس کے الفاظ میں:

''تاریخ کچھ نہیں کیا کرتی،اس کے پاس نہ تو بے پناہ دولت ہوا کرتی ہے نہ ہی یہ جنگیں کیا کرتی ہے۔یہ انسان ہی ہوتا ہے، حقیقی انسان، جو یہ سب کچھ کرتا ہے۔وہی ملکیت رکھتا اور وہی لڑائی کرتا ہے۔تاریخ کسی طور انسان کو اپنے کسی مقاصد کیلئے استعمال نہیں کیا کرتی۔تاریخ،انسان کی اپنے مقاصد کے حصول کی تگ ودو کی سرگرمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔''(مارکس/اینگلز۔مقدس خاندان)

مارکسزم جو کچھ کرتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ فرد کے کردار کو اسی طرح بیان کرتا ہے جیسا کہ سماج نے اسے دیا ہوتا ہے اور جو آخر کار ایک مخصوص طبقے کے مفادات کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ خیالات اور تصورات کا کوئی جداگانہ وجود نہیں ہوتا۔جرمن آئیڈیالوجی میں مارکس لکھتا ہے کہ ''زندگی کا تعین شعور سے نہیں ہوتا بلکہ شعور کا زندگی سے ہوا کرتا ہے۔''لوگوں کے افکار اور افعال سماجی تعلقات سے مشروط ہوتے ہیں جن کا ارتقا کسی طور مرد وزن کی ذاتی خواہشات کے تابع نہیں ہوا کرتا بلکہ جو مطلق قوانین کے تحت بنتے بگڑتے ہیں اور جو آخری تجزیے میں پیداواری قوتوں کی ترقی کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں۔ان عوامل کے مابین باہمی تعلق کا تانا بانا ایک ایسے گنجلک انداز میں بُنا ہوا ہوتا ہے جسے دیکھ پانا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ان تعلقات کا مطالعہ ہی مارکسزم کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

نظریہءتاریخ کی بنیاد ہے۔آیئے ہم یہاں ایک مثال دیتے ہیں۔برطانوی انقلاب کے وقت اولیور کراماویل کو پختہ یقین تھا کہ وہ ہر فرد کے حق کیلیئے لڑ رہا ہے تاکہ وہ خداوند سے اپنے ضمیر کے مطابق مانگ سکے۔لیکن تاریخ کی اپنی پیش رفت نے یہ ثابت کیا کہ کراماویل کا انقلاب، برطانوی بورژوازی کی طاقت میں آنے کیلیئے ناقابلِ مزاحمت پیش قدمی ثابت ہوا۔سترہویں صدی میں برطانیہ میں پیداواری قوتوں کی ترقی نے کوئی اور نتیجہ پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔

1789-93ء کے عظیم فرانسیسی انقلاب کے قائدین نے ''آزادی، برابری اور اخوت'' کے نعرے کے تحت اپنی لڑائی لڑی تھی۔انہیں یقین تھا کہ وہ انصاف اور دلیل کے آفاقی قوانین کیلیئے جدوجہد کررہے ہیں۔ تاہم اپنے تصورات اور ارادوں کے برعکس جیکوبنز (**Jacobins**) فرانس میں بورژوازی کی حکمرانی کیلیئے فضا ہموار کررہے تھے۔سماجی ارتقا کے اس مقام پر اور کوئی حل ممکن نہیں تھا۔

مزدور تحریک کے نکتہ نظر سے مارکس کی عظیم خدمت یہ ہے کہ وہ پہلا فرد تھا کہ جس نے یہ وضاحت کی کہ سوشلزم صرف ایک اچھا نظریہ ہی نہیں بلکہ یہ سماجی ارتقا کا ایک ضروری نتیجہ بھی ہے۔ مارکس سے پہلے کے سوشلسٹ مفکرین اور یوٹوپیائی سوشلسٹ حضرات نے ایسے آفاقی قوانین دریافت اور لاگو کرنے کی کوشش کی کہ جن کے باعث انسانی عقل ودانش کو طبقاتی سماج کی نابرابری پر فتح حاصل ہو جائے۔اس کیلیئے ضروری تھا کہ ایسا ایک تصور پیدا کیا جائے جس کے بعد ایسے سبھی مسائل حل ہو جائیں گے۔یہ ایک خیال پرستانہ نکتہ نظر ہے۔یوٹوپیائی سوشلسٹوں کے برخلاف، مارکس نے کبھی بھی عمومی سماجی قوانین دریافت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔اس نے ایک مخصوص سماج یعنی سرمایہ دارانہ سماج کی حرکت کے قانون کا تجزیہ کیا اور وضاحت کی کہ کیسے اس نے جنم لیا، کیسے یہ پروان چڑھا اور کس طرح سے ایک مخصوص مرحلے پر پہنچ کر یہ ختم ہو جائے گا۔اس بڑے کام کو مارکس نے اپنی کتاب ''سرمایہ'' کی تین جلدوں میں بیان کیا۔

مارکس اور ڈارون

(c) ketabton.com: The Digital Library

چارلس ڈارون اپنی جبلت میں مادہ پرست تھا جس نے وضاحت کی کہ مختلف انواع کا ارتقا فطری ماحول کے اثرات کے نتیجے میں ہوا ہے۔ کارل مارکس نے وضاحت کی کہ نسلِ انسانی کا ارتقا ایک ایسے ''مصنوعی'' ماحول سے ہوا، جسے سماج کہتے ہیں۔ فرق ایک طرف یہ ہے کہ فطرت کی نسبتاً سادگی کے مقابلے میں انسانی سماج کا کردار بہت پیچیدہ ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ انسانی سماج میں تبدیلی کا عمل، فطری انتخاب کے ارتقائی عمل کی انتہائی غیر معمولی سست روی کے مقابلے میں بہت تیز رفتار ہوتا ہے۔ پیداوار کے سماجی تعلقات کی بنیاد پر ہی پُر پیچ قانونی اور سیاسی شکلیں اپنی نظریاتی ،ثقافتی اور مذہبی عکاسی کے ساتھ کھڑی ہوتی ہیں۔ شکلوں اور نظریات کے اس پیچیدہ ڈھانچے کو بعض اوقات سماج کا بالائی ڈھانچہ (Super Structure) بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ہمیشہ معاشی بنیادوں پر ہی استوار ہوتا ہے، لیکن یہ بالائی ڈھانچہ، معاشی بنیادوں سے اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے اور پھر اسی پر براجمان ہو کر یہ سب کچھ کرتا ہے اور کبھی کبھار تو فیصلہ کن انداز میں کرتا ہے۔ بنیاد اور بالائی ڈھانچے کے مابین یہ جدلیاتی تعلق بہت پیچیدہ ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ واضح اور صاف بھی نہیں ہوا کرتا۔ لیکن آخری تجزیے میں معاشی بنیاد ہی فیصلہ کن ثابت ہوا کرتی ہے۔ جائیداد کے رشتے ہی، طبقات کے مابین تعلقات کا قانونی اظہار ہوا کرتے ہیں۔ پہلے تو یہ تعلقات، اپنے قانونی اور سیاسی اظہار میں، پیداواری قوتوں کی ترقی میں معاونت کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن پیداواری قوتوں کی ترقی، مروجہ جائیدادوں کے رشتوں کی پیش کردہ حدود کو سامنے لے آتی ہے۔ موخرالذکر بعد میں پیداواری قوتوں کی ترقی کے رستے میں رکاوٹ بننا شروع ہو جاتے ہیں اور یہیں کہیں وہ مرحلہ موجود ہوتا ہے جہاں ہم انقلاب کے عہد میں داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

خیال پرست انسانی شعور کو سبھی انسانی افعال کی وجہ محرکہ اور تاریخ کا جذبہ محرکہ قرار دیتے ہیں لیکن تمام انسانی تاریخ جو ثابت کرتی ہے وہ اس کے بالکل الٹ ہے۔ عمومی طور پر انسانی شعور ترقی پسند یا انقلابی نہیں ہوتا۔ واقعات کے عمل کے معاملے میں یہ بہت سُست اور انتہائی قدامت پسند ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ تبدیلی کو پسند نہیں کرتے ۔ تبدیلی کے اس موروثی خوف کی جڑیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

اجتماعی نفسیات میں بہت گہرائی تک پیوست ہوتی ہیں۔ یہ اس دفاعی میکنزم کا حصہ ہے جو کہ نوعِ انسانی کے قدیم ماضی سے جڑا چلا آ رہا ہے۔ ایک عمومی اصول کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج اس وقت تک آگے پیش قدمی نہیں کرتا جب تک کہ اس کو انتہائی ضرورت کے دباؤ کے تحت مجبور نہ کیا جائے۔ جہاں تک بھی اور جب تک ممکن ہوتا ہے مرد و زن، پرانے نظریات کے ساتھ خلط ملط ہو کے، ان پر غور و فکر کئے بغیر، لگے بندھے طریقے سے تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ بنے بنائے راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔ جس طرح کسی مشینری میں موجود توانائی اپنا کام کر رہی ہوتی ہے ایسے ہی روایت، عادت اور یکسانیت انسانی ذہن پر بہت بڑا بوجھ بنی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج پر حاوی نظریات، واقعات سے بہت پیچھے چل رہے ہوتے ہیں۔ اس نظریاتی جمود کو توڑنے کیلئے واقعات کے آہنی ہتھوڑوں اور طوفانی تھپیڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بعد ہی لوگ مروجہ نظام، اس کے نظریات اور اس کی اقدار بارے سوچنا اور سوال کرنا شروع کرتے ہیں۔ یہ سارا انقلاب اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہوتا ہے کہ معاشی ترقی اور موجود سماجی ڈھانچے کے مابین پنپتے چلے آ رہے تضادات، اب نا قابلِ برداشت ہو چکے ہیں۔ یہ مرکزی تضاد صرف اسی صورت ہی ختم یا حل کیا جا سکتا ہے کہ مروجہ نظم و نسق کو اکھاڑ پھینک دیا جائے اور اس کو نئے سماجی تعلقات سے آشنا اور استوار کیا جائے جن کی مدد سے معاشی بنیادوں کو بالائی ڈھانچے کے ساتھ ہم آہنگ کیا اور رکھا جا سکے۔ ایک انقلاب کے دوران سماج کی معیشت کو بنیادی نوعیت کی تبدیلی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی قانونی اور سیاسی بالائی ڈھانچہ ایک کامل اور موثر تبدیلی سے گزرتا ہے۔ ہر معاملے میں نئے اور اعلیٰ پیداواری تعلقات پرانے سماج کی کوکھ سے جنم لے کر پل چکے ہوتے ہیں اور تقاضا کر رہے ہوتے ہیں کہ نئے سماجی نظام کی فوری ضرورت کو یقینی بنایا جائے۔

تاریخی مادیت

مارکسزم اس چھپے ہوئے جوہر کا تجزیہ کرتا ہے جو کہ اولین قبائلی سماج سے لے کر موجودہ جدید سماج کی ترقی کے پیچھے کارفرما چلا آ رہا ہے۔ اس ٹیڑھے رستے کی کھوج لگانے کا طریق کار، تاریخ

(c) ketabton.com: The Digital Library

طریق کار ہمیں تاریخ کو سمجھنے کی سُدھ بُدھ فراہم کرتا ہے۔ یہ سائنسی کی مادی تعبیر کہلاتا ہے۔ لیکن یہ تاریخ کو بے ربط اوران دیکھے واقعات کا سلسلہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک قابل فہم اور مربوط عمل کے طور پر پرکھتا ہے۔ یہ عمل اور ردعمل کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو سیاست ،معیشت سمیت سماجی ترقی کے کُلی طرز کا احاطہ کرتا ہے۔ان تمام مظاہر کے مابین پیچیدہ جدلیاتی تعلق کو سمجھنا ہی تاریخی مادیت کا فریضہ ہے۔''رومن سلطنت کا زوال اورانہدام'' کے مصنف اور عظیم برطانوی مورخ ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ ''نسل انسانی کی بیوقوفیوں، جرائم اور بدقسمتیوں کا ایک چھوٹا سے کتابچہ ہے۔'' تاریخ کی جدیدترین مابعد الجدید (Post Modernist) تشریح بھی اپنی اصل میں کچھ نیانہیں کہہ پائی اورابھی تک بات وہیں کی وہیں ہے جس کے مطابق تاریخ محض ''بیان کی گئی باتوں'' کا غیرمربوط سلسلہ ہے جس کا کوئی نامیاتی ربط نہیں اور جو اندرونی معانی اور منطق سے محروم ہے، کسی بھی سماجی معاشی نظام کو ایک دوسرے سے بہتر یا بدتر نہیں قرار دیا جاسکتا چنانچہ ترقی یا بدحالی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مابعدالجدید نکتہ نظر کے مطابق تاریخ اتفاقیہ واقعات یا حادثات کے بے معنی اور نا قابل فہم سلسلے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ کسی قاعدے قانون کے تحت تو ہوتی نہیں کہ ہم اس کی تشریح کرسکیں۔ چنانچہ اسے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرنا کارزیاں ہے۔ اس تصور میں ایک تغیر جو سامنے آیا ہے اور جو کچھ علمی حلقوں میں بہت مقبول بھی ہے، وہ یہ ہے کہ کلچر اور سماجی ترقی کی اعلیٰ یا کمتر صورتوں جیسی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ایسا کچھ ہوتا ہی نہیں جسے ترقی کہا جاتا ہے، ان کے نزدیک یہ انیسویں صدی کا ایک فرسودہ نظریہ ہے جسے وکٹورین لبرلز، فیبئن سوشلسٹوں اور کارل مارکس نے مقبول بنایا تھا۔

تاریخ میں ترقی کا یہ انکار، زوال کا شکار بورژوازی کی اس نفسیات کو ظاہر کرتا ہے جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کے زوال کا نتیجہ ہے۔ یہ نفسیات اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ترقی کا عمل اپنی حدود کو پہنچ چکا ہے اوراب یہ ہر چیز کو تہس نہس کرنے کے درپے ہو چکا ہے۔ بورژوازی اوراس کے نمائندہ دانشور اس بات کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

اہل ہی نہیں ہیں۔لینن نے ایک بار کہا تھا کہ ایک کھائی کے کنارے کھڑا افرد معقولیت سے عاری ہو جاتا ہے۔تاہم انہیں حقیقی صورتحال کا کچھ نہ کچھ دھندلا سا عکس دکھائی ضرور دے رہا ہے اور وہ اپنے نظام پر طاری ہو چکی پژمردگی کے حوالے سے ادھر اُدھر سے جواز اور دلائل ڈھونڈنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔اسی حواس باختگی میں وہ ترقی کے امکان کے تصور کو ہی یکسر مسترد کرنے پر اتر آئے ہیں۔ترقی کا تصور ان کے شعور میں اس حد تک مبہم ہو چکا ہے جیسے یہ کسی غیر انسانی دنیا کا قصہ ہو۔یہاں تک کہ سٹیفن جے گولڈ جیسے مایہ ناز مفکر (جس کی Dialectical Punctuated Equilibrium کی تھیوری نے اس تصور کو ہی بدل کے رکھ دیا کہ ارتقا محسوس شدہ ہوا کرتا ہے) نے یہ دلیل دی کہ ارتقا کے ضمن میں نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کا تصور ہی غلط ہے تاکہ مائکروبز (Microbes)(ایک خلیے یا اس سے کم پر مشتمل جاندار جنہیں مائیکروسکوپ سے دیکھا جا سکتا ہو) کو اسی سطح پر لے جایا جا سکے جہاں انسان ہوتے ہیں۔ایک حوالے سے یہ بات درست بھی ہے کہ سبھی زندہ اشیا ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں،انسانی جینوم نے اس بات کو واضح انداز میں ثابت بھی کر دیا ہے۔نسل انسانی کسی قادرِ مطلق کی تخلیق نہیں ہے بلکہ ارتقا کی پیداوار ہے۔ نہ ہی یہ درست ہے کہ ارتقا کو کسی عظیم منصوبے (Grand Design) کی ایک شکل سمجھا جائے کہ جس کا مقصد ہم جیسی مخلوق تخلیق کرنا تھا۔تاہم ایک غلط تصور کو رد کرتے ہوئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری انتہا تک چلے جائیں اور مزید غلطیوں کا ارتکاب کرتے جائیں۔سوال یہ نہیں کہ آپ کسی مقدور قسم کے منصوبے کو تسلیم کرتے ہیں،خواہ اس کا تعلق کسی آسمانی مداخلت سے ہے یا علمِ توافق (Teleology) سے۔لیکن یہ ضرور واضح ہے کہ ارتقائی قوانین فطرت کی میراث ہوتے ہیں اور وہی درحقیقت زندگی کی سادہ صورتوں کی زیادہ پیچیدہ صورتوں میں ترقی کو متعین کرتے ہیں۔زندگی کی ابتدائی ترین شکلیں مستقبل کی تمام تر ترقی کے امکانات کو اپنی کوکھ میں لئے ہوئے تھیں۔اس بات کی وضاحت ممکن ہے کہ آنکھوں،ٹانگوں اور دوسرے اعضا کی ترقی کیسے ہوئی، اس کیلئے کسی تقدیری منصوبے کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ایک مخصوص مرحلے پر آکر ہم ایک مرکزی

(c) ketabton.com: The Digital Library

اعصابی نظام اور ذہن سے متمکن ہوتے ہیں۔آخر کار ہم ہوموسپئینز (Homo Sapeins) تک پہنچ کر انسانی شعور کی منزل کو پالیتے ہیں۔یہاں مادہ اپنے بارے میں باشعور بن جاتا ہے۔غیر نامیاتی مادے سے نامیاتی مادے(زندگی) تک کی ترقی کے عمل کے بعد سے یہ سب سے اہم ترین انقلاب ہے۔

اپنے ناقدین کو خوش کرنے کیلیئے ہم اپنے نکتہ نظر میں سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہیں گے۔ بلاشبہ مائکروبز اگر اپنا کوئی نکتہ نظر رکھنے کی اہلیت رکھتے تو شاید وہ بہت سنجیدہ اعتراضات اٹھاتے،لیکن چونکہ ہم انسان ہیں اس لئے ہمیں لازم ہے کہ ہم چیزوں کو ویسے دیکھیں جیسی وہ انسانی آنکھوں سے نظر آرہی ہوتی ہیں اور ہم یہ اصرار کرتے ہیں کہ ارتقا دراصل زندگی کی سادہ شکلوں سے زیادہ پیچیدہ اور مختلف الطرز شکلوں کی طرف ترقی کو پیش کرتا ہے،دوسرے الفاظ میں زندگی کی نچلی سے اعلیٰ شکلوں کی طرف ترقی۔اس قسم کی ترتیب پر اعتراض کرنا کسی حد تک بے تکا اور سائنسی کی بجائے دانشورانہ لگتا ہے۔تاہم یہ سب کہنے سے ہرگز یہ مقصد نہ لیا جائے کہ مائیکروبز کے خلاف بات کی جارہی ہے۔جو بہرحال ہم سے کہیں زیادہ طویل عرصے تک موجود رہے اور اگر سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ کر نہیں پھینکا جاتا تو شاید وہی ہوں جنہیں آخری ہنسی ہنسنے کا موقع مل جائے۔

تاریخ کی قوتِ محرکہ

اپنی کتاب سیاسی معاشیات پر تنقید(The Critique of Political Economy)میں مارکس نے پیداواری قوتوں اور بالائی ڈھانچے کے مابین تعلقات کی اس طرح نشاندہی کی ہے:

''اپنی پیدا کردہ سماجی پیداوار کے بعد انسان ایسے بندھن میں بندھ جاتے ہیں جو کہ ان کی خواہشات سے آزاد اور راسخ ہوتے ہیں۔یہ پیداواری رشتے،مادی پیداواری قوتوں کی ترقی کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایک یقینی مرحلے کی نشاندہی کررہے ہوتے ہیں۔ مادی زندگی میں طرزِ پیداوار ہی زندگی کے سماجی، سیاسی اور روحانی پہلوؤں کا تعین کرتی ہے۔ یہ انسانوں کا شعور نہیں ہوتا جو کہ ان کے وجود کا تعین کرتا بلکہ اس کے برعکس ان کا سماجی وجود ان کے شعور کا تعین کرتا ہے۔''

جیسا کہ مارکس اور اینگلز نے بڑے کرب سے یہ لکھا تھا کہ تاریخ میں حصہ ڈالنے والوں کو شاید پوری طرح اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ وہ کون سے محرکات ہیں جو کہ ان کو سرگرم رکھتے تھے، چاہے اُن کے بارے ہم ایسے یا ویسے، جس قسم کے بھی دلائل اور جواز تلاش کرتے رہیں، لیکن ان محرکات کا وجود تھا اور ان کی حقیقی دنیا میں بنیادیں بھی تھیں۔

جیسا کہ چارلس ڈارون نے وضاحت کی ہے کہ انواع دائمی نہیں ہوا کرتیں بلکہ ان کا ایک ماضی، حال اور مستقبل بھی ہوتا ہے اور یہ کہ یہ بدلتی اور ترقی کرتی ہیں۔ ایسے ہی مارکس اور اینگلز نے کہا کہ ایک موجود سماجی نظام بھی حتمی اور دائمی نہیں ہوا کرتا۔ یہی ہر عہد کا واہمہ چلا آرہا ہے۔ ہر سماجی نظام یہی سمجھے چلا آرہا ہے کہ صرف وہی انسانوں کے زندہ رہنے کی واحد ممکنہ صورت ہے۔ اس کے ادارے، اس کا مذہب، اس کی اخلاقیات ہی حرفِ آخر ہیں۔ آدم خوروں سے لے کر مصری پادریوں تک اور میری انتوینت (Marie Antoinette) سے لے کر روس کے زار تک سب کا یہی کامل ایمان تھا۔ آج بورژوازی اور اس کے معذرت خواہ بھی اسی قسم کے تیقن کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ہمیں معمولی سی تسلی دلائے بغیر یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''فری انٹرپرائز'' کا نظام ہی واحد ممکنہ نظام ہے۔ یہ یقین دہانی بھی ایسے وقت شدت سے کرائی جارہی ہے کہ جب یہ نظام ڈوب رہا ہے۔

آج کل نظریہ ارتقا کو کم ازکم پڑھے لکھوں میں عمومی مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔ ڈارون کے نظریات جو کہ اس کے عہد میں انقلابی سمجھے جاتے تھے، اب انہیں الہامی سمجھا جانے لگا ہے۔ تاہم ارتقا کو عام طور پر ایک ایسا سست اور تدریجی عمل سمجھا جاتا ہے جس میں کوئی مداخلتیں یا تندوتیز سرکشیاں رونما نہیں ہوتیں۔ سیاست میں اس قسم کی منطق کو تواتر

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے ساتھ اصلاح پسندی کیلئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔بدقسمتی سے یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔آج بھی ارتقا کے حقیقی میکنزم کا معاملہ ویسے ہی ہے جیسے ایک کتاب سات صندوقوں میں بند ہو۔ یہ بات کچھ حیران کن لگتی ہے کہ ڈارون کو خود بھی اس بات کی سمجھ نہیں آسکی۔ دس سال یا اس سے کچھ زیادہ وقت ہو چلا کہ جب سٹیفن جے گولڈ نے ،جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے،علم ارضیات میں نئی دریافتیں کیں جن سے یہ ثابت ہوا کہ ارتقا ایک تدریجی عمل نہیں ۔ایسے بہت طویل عرصے بھی بیتے ہیں جب کوئی بڑی تبدیلیاں مشاہدے میں نہیں آئیں۔لیکن ایسے میں ہی ایک مخصوص مرحلے پر ارتقا کا یہ خط ایک دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔ان میں وہ حقیقی حیاتیاتی انقلاب بھی شامل ہے کہ جس دوران کئی انواع بڑے پیمانے پر نیست ونابود ہوگئیں جبکہ کئی ایک تیزی سے ابھر کے سامنے بھی آئیں۔

سماج اور فطرت کے مابین مطابقت بہرحال تخمینے پر ہی مبنی ہوا کرتا ہے۔لیکن اس کے باوجود تاریخ کا مصنوعی ترین مشاہدہ اور تجزیہ یہی ثابت کرتا ہے کہ تدریجی وضاحت قطعی بے بنیاد ہے۔سماج بھی فطرت کی مانند،سست اور تدریجی تبدیلی کے طویل المیعاد عرصوں سے گزرتا ہے لیکن جنگوں اور انقلابات جیسے دھماکوں سے تبدیلی کا عمل،شدت کے ساتھ تیز رفتار ہو جاتا ہے۔حقیقت بھی یہی ہے کہ یہی واقعاتی عناصر ہی تاریخی ترقی کی قوتِ محرکہ کا کام دیتے ہیں۔انقلاب کی بنیادی وجہ یہ حقیقت ہوتی ہے کہ ایک مخصوص سماجی معاشی نظام اپنی حدود کو پہنچ چکا ہے اور یہ پہلے کی مانند پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کے قابل نہیں رہا۔

تاریخ کی رنگارنگی

وہ لوگ جو انسانی سماجی ترقی کے قوانین سے انکار کرتے ہیں وہ چاروناچار تاریخ کو ایک موضوعی اور اخلاقی نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں۔لیکن گبن کی طرح (اس کی غیر معمولی صلاحیت سے قطع نظر) یہ سب لوگ اس بیہودہ وحشیانہ تشدد کو سر کھجاتے ہوئے ہی دیکھتے ہیں کہ جس کے دوران انسان، انسان ہی کے خلاف غیر انسانی سلوک کرتا نظر آتا ہے۔ایک سائنسی نکتہ نگاہ کی بجائے

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہمیں ایک فرد کی سوچ حاوی نظر آتی ہے۔ تاہم معاملہ اخلاقی پندونصیحت کا نہیں بلکہ ایک معقول بصیرت کا متقاضی ہے۔ ادھر اُدھر کے حقائق سے قطع نظر اور بالاتر ہو کر یہ لازمی ہے کہ ایسے وسیع النظر اور کشادہ رجحانات دریافت کئے جائیں کہ جن سے ایک سے دوسرے سماجی نظام کی طرف تبدیلیاں ممکن ہوسکیں اور وہ بنیادی قوتِ محرکہ دریافت کی جائے جو کہ ان تبدیلیوں کا تعین کر سکے۔ تاریخ کی بابت، جدلیاتی مادیت کا طریقہ کار استعمال کرنے سے یہ فوری طور پر آشکار ہو جاتا ہے کہ انسانی تاریخ اپنے ہی قوانین رکھتی ہے اور یہ بھی کہ انسانی تاریخ کو ایک جاری عمل کے طور پر سمجھنا ممکن ہے۔ مختلف سماجی ومعاشی نظاموں کے عروج وزوال کو سائنسی طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسانی تہذیب وثقافت کس طرح سے پروان چڑھی اور کیسے انسان کے فطرت پر غلبے کو تقویت ملی! بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سماج ہمیشہ سے لگا بندھا چلا آ رہا ہے اور یہ بھی کہ مذہب، اخلاقیات اور نظریاتی اقدار حتمی اور بے بدل ہوتے ہیں اور ان سب کے ساتھ انسانی فطرت بھی جوڑ دی جاتی ہے۔ لیکن تاریخ کے بارے ہلکی سی سوجھ بوجھ بھی یہ ظاہر کر دیتی ہے کہ یہ غلط ہے۔ تاریخ بہت سے سماجی معاشی نظاموں کے عروج وزوال سے بھری پڑی ہے۔ انفرادی مردوزن کی طرح سماج بھی پیدا ہوتے، پروان چڑھتے، اپنی حدود کو پہنچتے، انحطاط کا شکار ہوتے ہیں اور آخر کار ایک نیا سماجی نظم ونسق ان کی جگہ لے لیتا ہے۔

آخری تجزیے میں کسی بھی سماجی ومعاشی نظام کی اہلیت کا تعین اس کی پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کی صلاحیت کرتی ہے۔ مذہب، سیاست، فلسفہ، اخلاقیات، مختلف طبقات کی نفسیات اور لیڈروں کی انفرادی خصوصیات جیسے بہت سے دوسرے عناصر اس پر پیچ معاملے میں مداخلت کرتے ہیں۔ لیکن پھر یہ سب کچھ بادلوں میں سے نہیں ٹپکتا اور ان حالات میں ہوتا ہے جو مردوزن کی خواہشات سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایک سماج جو کہ عروج کی کیفیت میں ہو، جو اپنی پیداواری قوتوں کو ترقی دے رہا ہوتا ہے اور تہذیب وثقافت کے نئے روشن پہلوؤں کو بڑھاوا دے رہا ہو، وہ اس سماج سے کہیں مختلف نفسیات کا حامل ہوتا ہے کہ جو جمود اور انحطاط کی حالت میں پہنچا ہوا ہو۔ تاریخی صورتحال ہی ہر شے کا تعین کرتی ہے اور یہ موجود اخلاقی فضا کے ساتھ ساتھ مردوزن

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے مروجہ سیاسی و مذہبی اداروں کے بارے میں رویوں کو متاثر کرتی ہے۔
یہاں تک کہ یہ انفرادی لیڈروں کی صلاحیتوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے شباب کے دنوں میں کئی دیوہیکل کارہائے نمایاں سرانجام دیے، اس نے پیداواری قوتوں کو غیر معمولی سطح پر ترقی دی جس کی مدد سے یہ اس قابل ہوا کہ انسانی تہذیب کی سرحدوں کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔لوگوں نے محسوس کیا کہ نظام کا خاصا چلی آ رہی تمام ناانصافیوں اور استحصال کے باوجود سماج آگے جا رہا تھا۔اس احساس نے ایک عمومی رجائیت اور ترقی کی روح کو پروان چڑھایا جو کہ پرانے لبرلزم کا خاصا تھا جسے یہ پختہ یقین ہوتا تھا کہ آج کا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہے اور آنے والا کل آج سے اچھا ہوگا۔لیکن اب ایسی کوئی کیفیت ہے نہ حالات۔ترقی بارے قدیم خوش گمانی، رجائیت اور اندھے اعتماد کی جگہ اب حال بارے اتھاہ بدگمانی اور مستقبل بارے شدید مایوسی نے لے لی ہوئی ہے۔ ہر طرف، ہر جگہ اور ہر سطح پر خوف اور عدمِ تحفظ کا یہ احساس اس حقیقت کی نفسیاتی عکاسی کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اب کہیں بھی کوئی ترقی پسندانہ کردار ادا کرنے کی اہلیت سے محروم ہو چکا ہے۔ 19ویں صدی میں لبرلزم نے بورژوازی کے ایک نظریے کے طور پر ترقی کی اور جمہوریت کیلئے اقدامات کیے۔لیکن آج کے عہد کا نیولبرلزم محض ایک نقاب ہے جس کے پیچھے انتہائی سفاکانہ استحصال کا مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے۔ کرۂ ارض کے ساتھ زنا بالجبر کیا جا رہا ہے اور مستقبل کی نسلوں کی زندگیوں بارے پرواہ کیے بغیر ماحول کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے بورڈز میں براجمان لوگوں، جو کہ امریکہ سمیت ساری دنیا پر حکمرانی مسلط کیے ہوئے ہیں، کا اول و آخر ایک ہی مقصدِ حیات ہے کہ یہ اپنے آپ کو امیر سے مزید امیر کرتے جائیں، زیادہ سے زیادہ لوٹ مار کر کے، اثاثوں کو ہڑپ کر کے، بدعنوانی کر کے، نجکاری کے ذریعے عوامی اداروں کو بیچ کھا کے، ہر قسم کی طفیلیت کرتے ہوئے۔۔۔ایک گہرے زوال کی حالت میں بورژوازی صرف یہی کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہے۔

سماجوں کا عروج و زوال

(c) ketabton.com: The Digital Library

''ایک سماج سے دوسرے سماج میں تبدیلی کے عمل کا تعین ہمیشہ سے پیداواری قوتوں کی ترقی سے ہوتا چلا آ رہا تھا، جو تکنیک اور محنت کی تنظیم سے منسلک تھی۔ایک مخصوص مقام تک سماجی تبدیلیاں اپنے کردار میں مقداری رہتی ہیں اور وہ سماج کی بنیادوں یعنی جائیدادوں کی مروجہ شکلوں کو کچھ نہیں کہا کرتیں۔لیکن پھر وہ مرحلہ آ جاتا ہوتا ہے کہ جب پختہ ہو چکیں پیداواری قوتیں جائیداد کی پرانی شکلوں کے اندر خود کو موزوں نہیں سمجھتیں، ایسے میں سماجی نظم میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔جو کہ سماج کو ہلا دینے والے واقعات میں دھکیل دیتی ہے۔'' (مارکسزم، ہمارے عہد میں۔لیون ٹراٹسکی۔اپریل 1939ء)

سوشلزم بارے ایک عام دلیل یہ دی جاتی ہے کہ انسانی فطرت کو تبدیل کرنا سراسر ناممکن ہے، کیونکہ لوگ فطری پر خودغرض اور لالچی اور وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی فطرت جیسی کوئی مافوق التاریخ چیز نہیں ہوا کرتی۔ہمارا کہنا یہ ہے کہ انسانی فطرت، انسانی ارتقا کے عمل کے دوران کئی بار تبدیلی کے مراحل سے گزری ہے۔مرد و زن مسلسل محنت کے ذریعے فطرت کو بدلتے رہتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ خود کو بھی بدل رہے ہوتے ہیں۔جہاں تک اس منطق کی بات ہے کہ لوگ فطری طور پر لالچی اور خودغرض ہوتے ہیں تو یہ بات انسانی ارتقا کے عمل سے غلط ثابت ہوتی ہے۔ہمارے ابتدائی آباؤ اجداد جو کہ پوری طرح انسان نہیں تھے، اور باقی جانداروں کی بہ نسبت قد و قامت میں چھوٹے اور جسمانی طور پر کمزور بھی تھے۔ان کے دانت اور کلائیاں بھی مضبوط نہیں تھیں۔ان کی جھکی ہوئی کمر یہ بتاتی ہے کہ وہ اپنے مطلوبہ شکار کو پکڑ کر کھانے کیلئے یا پھر کسی درندے سے بچنے کیلئے، جو انہیں کو کھا جانے کے درپے ہوتا تھا، صحیح طور پر بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ان کے دماغ کا سائز بھی چمپینزی کے دماغ جتنا ہوتا تھا۔شمالی افریقہ کے جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہمارے ان آباؤ اجداد کو دوسری زندہ انواع کے مقابلے میں بہت سی کمزوریاں گھیرے ہوئے تھیں۔۔۔سوائے ایک بنیادی پہلو کے۔

اینگلز اپنے شاندار مضمون ''بندر سے انسان تک کے سفر میں محنت کا کردار'' میں لکھتا ہے کہ کھڑے ہونے کی پوزیشن نے ہاتھوں کو آزاد کیا جو کہ پہلے ایسی حالت میں ہوتے تھے کہ جن کی

(c) ketabton.com: The Digital Library

مدد سے درختوں پر چڑھا اور دوسرے افعال کئے جاسکتے تھے۔ پتھروں کے اوزاروں کی تخلیق ایک معیاری جست ثابت ہوئی جس نے ہمارے آباؤ اجداد کو ارتقائی فوقیت سے ہمکنار کیا۔لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ان کا یکجائیت، اجتماعی پیداوار اور سماجی زندگی کا مضبوط احساس تھا، اس کی بدولت ہی زبان کی ترقی ممکن ہوئی۔ ہمارے آباؤ اجداد، جن کی مل کر شکار کرنے کی مجبوری، انہیں خوراک کی جستجو میں ایک جگہ سے دوسری ہجرت کرنے پر مجبور کرتی رہتی تھی، ایسے میں انسانی بچوں کی باقی جانوروں کے بچوں کی نسبت حد سے زیادہ کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے تحفظ کے لئے باہمی جڑت اور یکجہتی کی ضرورت کو جنم دیا اور یہی جڑت ان کے قبیلے یا گوت کے تحفظ کی بھی بنیاد بنی۔ ہم کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تعاون اور یکجہتی کے اس مضبوط احساس کے بغیر ہماری نوعِ انسانی اپنی پیدائش سے پہلے ہی معدوم ہو چکی ہوتی۔

ہم اس کا مشاہدہ آج بھی کر سکتے ہیں، اگر آج کوئی بچہ ڈوب رہا ہو تو بہت سے لوگ اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر اس کو بچانے کیلئے پانی میں کود پڑیں گے۔ بے شمار لوگ دوسروں کو بچاتے ہوئے ڈوب کے مرے بھی ہیں۔ اسے محض متکبرانہ نتائج کی صورت میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے ایک چھوٹے قبائلی گروہ کے خون کے رشتوں کے بندھن سے جوڑا جاسکتا ہے۔ ایسا کرتے وقت ایسے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ کسے بچانے جا رہے ہیں اور نہ ہی کسی انعام یا اجر کی غرض ہوتی ہے۔ یہ بے غرضانہ رویہ مطلق خودرو ہوتا ہے اور اس کی جڑیں کہیں دور گہرائی میں، یکجہتی کی جبلت میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ دلیل کہ لوگ فطری طور پر خودغرض ہوتے ہیں، انسانیت کے چہرے پر توہین آمیز طمانچہ ہے۔ یہ سوچ دراصل سرمایہ دارانہ سماج کی بدصورت اور انسان کش بیگانگی کی عکاسی کرتی ہے۔ ہماری نوعِ انسانی کی تاریخ کا بہت بڑا وقت وہ تھا کہ جب لوگ ایسے سماجوں میں رہتے تھے جہاں آج کے جدید معنوں میں نجی ملکیت نہیں ہوتی تھی، کوئی نقدی نہیں ہوتی تھی، کوئی مالک کوئی نوکر نہیں ہوتا تھا، کوئی بینکار کوئی جاگیردار نہیں ہوتے تھے، نہ ریاست تھی نہ منظّم مذہب، نہ پولیس اور نہ ہی قیدخانے۔ یہاں تک کہ ہمارے آج کے مروجہ معنوں میں خاندان بھی وجود نہیں رکھتا تھا۔ آج ہم میں سے بہت سوں کیلئے ایک ایسی دنیا کا تصور بھی محال ہے

(c) ketabton.com: The Digital Library

کہ جس میں یہ سب کچھ نہ ہو۔ یہ سب اس قدر فطری معلوم اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قادرِ مطلق کے بنائے ہوئے قانون کے عین مطابق ہو۔ حالانکہ ہمارے آباؤ اجداد ان سب کے بغیر بہت احسن طریقے سے معاملات چلاتے رہے ہیں۔ اجتماعی شکاری سماج سے مضبوط زراعت اور مزارعت کی جانب پیش رفت، پہلا عظیم سماجی انقلاب تھا جسے عظیم آسٹریلوی ماہر آثار قدیمہ اور مارکسسٹ گورڈن چائلڈ ''نیولیتھک انقلاب'' قرار دیتا ہے۔ کھیتی باڑی کیلئے پانی درکار ہوتا ہے، جب یہ ایک خاص سطح کی انتہائی بنیادی پیداوار سے آگے بڑھتی ہے تو اس کیلئے آبپاشی، کھدائی، ڈیم سازی اور بڑے پیمانے پر پانی کی ترسیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سماجی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ بڑے پیمانے کی آبپاشی کیلئے بڑے پیمانے کی تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کیلئے بہت زیادہ کام کرنے والوں اور ایک اعلی سطح کی تنظیم اور نظم وضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ محنت کی تقسیم پہلے بھی بچوں کی پیدائش اور ان کی نشوونما کی بنیاد پر صنفی تقاضوں کی بنیاد پر اپنی ابتدائی شکل میں موجود چلی آ رہی تھی۔ یہ تقسیم ایک بلند پیمانے پر ترقی پاتی چلی گئی۔ ٹیم کی شکل میں کام کرنے کیلئے ٹیم لیڈروں، فورمینوں اور نگرانوں وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسے افسروں کی ایک فوج کی بھی کہ جو اتنے بڑے منصوبے کی نگرانی بھی کر سکیں۔ اتنے وسیع پیمانے پر باہمی تعاون کیلئے منصوبہ بندی کے ساتھ سائنس اور تکنیک کی مشق کی بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ان چھوٹے گروہی قبیلوں کے بس کی بات نہیں تھی جنہوں نے قدیم سماج کے مرکزے کی بنیاد رکھی تھی۔ بڑی تعداد میں کام کرنے والوں کو منظّم اور متحرک کرنے کی ضرورت نے ایک مرکزی ریاست کے قیام کا رستہ ہموار کیا جس کی ایک مرکزی انتظامیہ اور فوج بھی ہو جیسا کہ مصر اور میسوپوٹیمیا میں ہوا۔ وقت کا استعمال اور تخمینہ سازی، پیداوار کے لازمی عناصر تھے اور یہ اپنے اندر ایک پیداواری قوت تھے۔ چنانچہ ہیروڈوٹس نے مصر میں جیومیٹری کا آغاز کیا تا کہ خالی زمینوں کی سالانہ بنیادوں پر دوبارہ سے حد بندی کی جا سکے۔ لفظ جیومیٹری کا مطلب بھی یہی ہے کہ زمین کی نہ کم نہ زیادہ پیمائش۔ کائنات، فلکیات اور ریاضی کے مطالعے نے مصر کے پادریوں کو یہ اہلیت فراہم کر دی کہ وہ دریائے نیل میں طغیانی اور دوسری پیش گوئیاں کریں۔ چنانچہ معاشی

(c) ketabton.com: The Digital Library

سرگرمی نے سائنس کی بنیاد رکھی۔ اپنی کتاب ''مابعدالطبیعات'' میں ارسطو کہتا ہے کہ ''انسان زندگی کی سہولتیں فراہم ہونے کے بعد سب سے پہلے خود کو فلسفے سے روشناس کراتا ہے۔'' کارل مارکس سے 2300 سال پہلے ارسطو کے یہ الفاظ، تاریخی مادیت کے دل کی آواز ہیں۔

امیر اور غریب، حکمران اور رعایا، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ کے مابین فاصلے کی بنیادی وجہ ذہنی اور جسمانی محنت کی تقسیم ہے۔فورمین عام طور پر جسمانی محنت نہیں کیا کرتا جو کہ ایک اہانت تصور کی جاتی ہے۔بائبل میں ''لکڑیاں کاٹنے والوں اور پانی بھرنے والوں'' کا تذکرہ ہے کہ جنہیں ثقافت سے باہر رکھا جاتا تھا۔ثقافت، جو کہ کئی پراسرار اور جادوئی پردوں میں لپٹی ہوئی ہوتی تھی اور جس کے رازوں کے تحفظ کی ذمہ داری پادریوں اور پروہتوں نے اپنے سر لی ہوئی تھی اور وہی اس کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔ یہاں ہم ایک طبقاتی سماج کے خدوخال دیکھتے ہیں۔سماج استحصال کرنے والوں اور نیم استحصال کرنے والوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر اس سماج میں جہاں آرٹ، سائنس اور حکومت پر اقلیت کی اجارہ داری ہوگی، یہ اقلیت اپنی پوزیشن کو اپنے مفادات کیلئے اچھے برے ہر طریقے سے استعمال کرے گی۔طبقاتی سماج کا یہ سب سے بنیادی راز ہے جو کہ پچھلے 12000 سالوں سے کارفرما اور کارگر چلا آرہا ہے۔اس دوران سماجی اور معاشی زندگی کی شکلوں میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں لیکن حاکموں اور محکوموں، امیروں اور غریبوں، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں کے درمیان بنیادی تعلقات ویسے کے ویسے چلے آرہے ہیں۔اسی طرح حکومت کرنے کی شکلیں بھی تبدیل ہوئیں لیکن ریاست کا کردار ویسے کا ویسا رہا۔یہ جبر کا اوزار بنی اور حکمران طبقے کی حکمرانی کا اظہار چلی آرہی ہے۔غلام دارانہ سماج کے عروج وزوال کے بعد جاگیرداری نے یورپ میں غلبہ حاصل کرلیا اور بعد میں سرمایہ داری نے اس کی جگہ لے لی۔ ہالینڈ اور اٹلی کے شہروں اور قصبوں میں سے ابھرنے والی ابتدائی بورژوازی، سولہویں اور سترہویں صدی میں ہالینڈ اور برطانیہ میں ہونے والے سرمایہ دارانہ انقلابات اور اس کے بعد فرانس کے 1789ء کے عظیم انقلاب کے بعد فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی۔ان سبھی تبدیلیوں

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے دوران کلچر، آرٹ، لٹریچر، مذہب اور فلسفے میں بہت دوررس تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔

ریاست

ریاست جبر کی ایک خاص طاقت ہوتی ہے جو کہ سماج سے بالا ہوتی ہے اور جو اپنے آپ سے خود کو تیزی سے بیگانہ بھی کرتی رہتی ہے۔ اس طاقت کی جڑیں قدیم ماضی میں پیوست چلی آ رہی ہیں لیکن حالات کی مناسبت سے اس کی شکلیں بدلتی رہی ہیں۔ جرمنوں اور آبائی امریکیوں کیلئے اس کا ظہور جنگی بینڈ باجوں سے ہوا جو جنگ کی قیادت کرنے والے کے گرد گائے بجائے جا رہے تھے۔ یہی معاملہ یونانیوں کے ساتھ ہوا جس کا احوال ہمیں ہومر کی عظیم نظموں میں ملتا ہے۔ حقیقت حال یہ تھی کہ قبائلی سرداروں کو اپنی ذاتی بہادری، دانش اور دیگر ذاتی صفات کی وجہ سے بہت اختیار حاصل ہوتے تھے۔ آج حکمران طبقے کو قیادت کی ذاتی صفات سے اس طرح سے کوئی سروکار نہیں ہے جیسا کہ بربریت کے عہد میں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اس کی جڑیں معروضی، سماجی اور پیداواری تعلقات اور سرمائے کی طاقت سے وابستہ ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ قیادت کرنے والا اچھا ہے یا برا، یا پھر بے نیاز۔ طبقاتی سماج کی اولین شکلیں ہمیں بتاتی ہیں کہ ریاست کس طرح ایک درندے کی طرح قدر زائد کے بڑے حصے کو ہڑپ کر جاتی تھی، عوام کو دبائے رکھتی تھی اور انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھتی تھی۔ اسی دوران ہی یہ محنت کی تقسیم کو بڑھاتی، سماج کو منظّم کرتی اور تعاون کو پہلے سے کہیں بلند و بالا سطح تک لے جاتی کہ جس کی بدولت یہ انسانی پیداواری محنت کو خواب وخیال جیسی بلندی تک پہنچاتی رہی۔ اپنی بنیاد میں یہ سارا کچھ کسانوں کی محنت کے بل بوتے پر تھا۔ ریاست کو بڑی تعداد میں کسانوں کی ضرورت ہوتی تھی کہ جو ٹیکس بھی دے سکیں اور ہر قسم کی بیگار محنت بھی کر سکیں۔ انہی دوستونوں پر ہی سماج استوار رہا۔ جو بھی اس پیداواری نظام کو کنٹرول کرتا تھا وہی طاقت اور ریاست کو بھی کنٹرول کرتا تھا۔ ریاستی طاقت کی جڑیں اور بنیادیں پیدواری تعلقات میں پنہاں تھیں نہ کہ ذاتی خوبیوں میں۔ اس قسم کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

سماجوں میں ریاستی اقتدار لازمی طور پر مرتکز اور افسر شاہانہ ہوتا تھا۔ اپنی نوع میں یہ ایک مذہبی کردار کا حامل اور پاپائیت کی طاقت سے مخلوط تھا جس کی سربراہی دیوتا نما بادشاہ کرتا اور جس کے نیچے افسروں، مصاحبوں، نگرانوں وغیرہ کی ایک فوج ہوا کرتی تھی۔ لکھنا ایک پراسرار آرٹ تھا جو کہ انہی چند لوگوں تک ہی محدود ہوتا تھا۔ چنانچہ اپنی ابتدا سے ہی ریاست کے دفاتر پراسرار چلے آ رہے ہیں۔ جہاں حقیقی سماجی تعلقات ایک بیگانہ کیفیت میں موجود ہوتے ہیں۔ معاملہ اب تک ایسا ہی چلا آ رہا ہے۔ برطانیہ میں اس پراسراریت کو شعوری طور پر اہتمام کے ساتھ، جشن، نمائش اور روایت کے ذریعے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ امریکہ میں اس کیلئے اور قسم کے ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں، ان میں صدر کی شان بان بھی شامل ہے، جو ریاستی طاقت کے مجسم تشخص کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم اپنی اساس میں ریاست کی ہر ایک شکل ایک طبقے کے باقی سماج پر غلبے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی اعلیٰ ترین جمہوری صورت میں بھی، یہ ایک طبقے، یعنی حکمران طبقے کی آمریت ہی کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ طبقہ ہی پیداواری ذرائع کا مالک اور ان کو کنٹرول کرتا ہے۔

جدید ریاست ایک افسر شاہانہ درندہ ہے جو کہ محنت کش طبقے کی پیدا کردہ دولت کے بہت بڑے حصے کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ مارکسسٹ، انارکسٹوں کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ریاست استحصال کا ایک خونخوار آلہ ہے جسے لازمی طور پر ختم ہونا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہو گا، کون کرے گا اور اس کا متبادل کیا ہوگا؟ کسی بھی انقلاب کیلئے یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ بالشویک انقلاب کے فوری بعد پھوٹ پڑنے والی خانہ جنگی کے دوران ٹراٹسکی نے انارکزم کے موضوع پر تقریر میں ریاست بارے مارکسی پوزیشن بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

''بورژوازی کا کہنا یہ ہے کہ ریاست کو نہ چھیڑا جائے۔ یہ پڑھے لکھے طبقے کی مقدس موروثی مراعت ہے۔ جبکہ انارکسٹ کہتے ہیں کہ ریاست کو کچھ نہ کہا جائے کیونکہ یہ ایک فضول ایجاد اور بیکار آلہ ہے۔ ہمارا اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ بورژوازی کہتی ہے یہ مقدس ہے۔ انارکسٹ کہتے ہیں اسے ہاتھ بھی نہ لگایا جائے کیونکہ یہ ایک ناپاک شے ہے۔ دونوں کہتے ہیں کہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

اسے نہ چھوا جائے لیکن ہم کہتے ہیں کہ اسے نہ صرف چھوا جائے بلکہ اسے اپنے ہاتھوں میں لیا جائے۔ اسے اپنے مفادات کے حصول کے لئے تشکیل دیا جائے تا کہ نجی ملکیت کا خاتمہ کیا جا سکے اور محنت کش طبقے کو نجات دلائی جا سکے۔'' (انقلاب کیسے مسلح ہوا؟ جلد 1 ٹراٹسکی، 1918ء)

مارکسزم وضاحت کرتا ہے کہ ریاست مسلح افراد کا ایک جتھہ ہوتی ہے جس میں فوج، پولیس، عدالتیں اور جیلیں شامل ہوتی ہیں۔ انارکسٹوں کے مبہم نظریات کے برخلاف، مارکس نے دلیل پیش کی کہ محنت کشوں کو استحصال کرنے والوں کی مزاحمت پر قابو پانے کیلئے ایک ریاست کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مارکس کی اس دلیل کو بورژوازی اور انارکسٹ دونوں نے بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ مارکس نے ''پرولتاریہ کی آمریت'' کی بات کی تھی جس کا سادہ سا مطلب ''محنت کشوں کا سیاسی اقتدار'' ہے۔ آج کل لفظ ''آمریت'' کے جو معانی اور تشریحات رائج ہیں، یہ مارکس کے دنوں میں اجنبی تھیں۔ ایک ایسا عہد جو کہ ہٹلر اور سٹالن کے ہولناک جرائم سے جانا پہچانا جاتا ہے اور جو مطلق العنان درندگی، اذیت گاہوں اور خفیہ پولیس کے دل دہلا دینے والے عناصر سے مزین ہے۔ لیکن مارکس کے وقتوں میں اس قسم کی باتوں کا تصور تک محال تھا۔ مارکس کے نزدیک آمریت کا لفظ ان معنوں میں ہی تھا جو کہ رومن امپائر میں رائج تھا کہ جب جنگ کی کیفیت میں عمومی قوانین کچھ عرصے کیلئے عارضی طور پر ایک طرف رکھ دیے جاتے تھے۔ رومن ڈکٹیٹر ایک ایسا غیر معمولی مجسٹریٹ ہوتا تھا جو کہ ایسی اتھارٹی استعمال کرتا تھا جو کہ عام مجسٹریٹ کی روزمرہ کی اتھارٹی سے کہیں بلند ہوتی تھی۔ اس ادارے کو ''عوام کا آقا'' کہا جاتا تھا۔ یعنی شہریوں کی فوج کا آقا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک فوجی حکمرانی ہوتی تھی جو کہ ہمیشہ ایک ایسے وقت میں، جب فوج کو محاذ جنگ میں اتارنا ہوتا، سامنے آتی تھی۔ جونہی مخصوص وقت ختم ہوتا تھا، آمر کا ادارہ بھی ختم ہو جاتا۔ روس میں سٹالن جیسی مطلق العنان آمریت کا تصور بھی مارکس کے رونگٹے کھڑے کر دیتا کہ جس میں ریاست، مراعات یافتہ افسر شاہی کے مفادات کیلئے محنت کشوں کا استحصال کرتی تھی۔ مارکس نے پرولتاریہ کی آمریت کے اپنے نظریے کی بنیاد 1871ء کے پیرس کمیون پر رکھی تھی

(c) ketabton.com: The Digital Library

جہاں پہلی بار عام انسانوں نے محنت کش طبقے کی سربراہی میں پرانی ریاست کو اکھاڑ پھینکا اور کم وبیش سماج کو تبدیل کرنے کا فریضہ شروع کردیا۔ کسی واضح عملی منصوبے، تنظیم اور قیادت کی غیر موجودگی کے باوجود عوام نے حیران کن غیر معمولی جرأت، پیش قدمی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ مارکس اور اینگلز نے پیرس کمیون کے تجربے کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ''کمیون نے کم سے کم ایک بات ثابت کر کے دکھادی کہ محنت کش بنی بنائی ریاستی مشینری کے ذریعے کچھ نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اسے اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر سکتے تھے۔'' (کمیونسٹ مینی فیسٹو؛ 1872 جرمن ایڈیشن کا دیباچہ)

سوشلزم کی طرف پیش قدمی ایک ایسے اعلیٰ سماج کی طرف سفر ہے جو حقیقی جمہوریت اور سب کیلئے بہتات کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، یہ سماجی تشکیل تبھی ممکن ہوسکتی ہے کہ جب سماج، صنعت اور ریاست کو چلانے کے عمل میں محنت کش طبقے کی عملی شعوری شمولیت موجود ہو۔ سرمایہ دار یا افسر شاہی کسی طور بھی رحمدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقتدار محنت کشوں کو نہیں سونپ سکتے۔ لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں قائم ہونے والی سوویت ریاست محنت کشوں کو نظم ونسق، محاسبے کے فرائض میں شریک اور ملوث کرنے کیلئے کام کرتی رہی تاکہ افسر شاہی اور ریاستی طاقت کی ''خصوصی عملداری'' کو کم سے کم کرنے کو یقینی بنایا جاسکے۔ افسروں کی تنخواہوں، اختیارات اور مراعات پر سخت پابندیاں عائد کی گئیں تاکہ ایک مراعات یافتہ پرت کی تشکیل کو روکا جاسکے۔ 1917ء کے بالشویک انقلاب کی قائم کردہ مزدور ریاست نہ تو افسر شاہانہ تھی اور نہ ہی مطلق العنان۔ اس کے برعکس، سٹالنسٹ افسر شاہی کی طرف سے عوام کے اختیار غصب کرنے سے پہلے، یہ ایسی جمہوری ریاست تھی کہ جو پہلے کبھی اور کہیں موجود نہ تھی۔ سوویتوں کے اقتدار کے بنیادی اصول نہ تو مارکس اور نہ ہی لینن کے ایجاد کردہ تھے بلکہ یہ پیرس کمیون کے ٹھوس تجربے پر قائم کئے گئے تھے، جن کی بعد میں لینن نے صریحاً تشریح کی تھی۔ لینن افسر شاہی کا سخت دشمن تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ''پرولتاریہ کو ریاست کی ضرورت اس لئے اور اس وقت کیلئے ہوتی ہے کہ جب تک یہ بیک وقت ختم اور غائب نہیں ہوجاتی۔'' ایک حقیقی اور خالص مزدور ریاست کا اس قسم کی افسر شاہانہ درندہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

صفت ریاست سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا جو آج وجود رکھتی ہے یا جو کم ازکم سٹالنسٹ روس میں موجود رہی۔لینن نے اپنی اہم ترین تحریروں میں سے ایک ''ریاست اور انقلاب''میں مزدور جمہوریت کی بنیادی شرائط یہ بیان کی تھیں۔

1۔واپس بلائے جانے کے حق (Right to Recall) کے ساتھ،تمام افسروں کو آزادانہ انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جائے گا۔

2۔ایک ہنرمند مزدور سے کسی افسر کی بھی اجرت زیادہ نہیں ہوگی۔

3۔کوئی باقاعدہ فوج یا پولیس نہیں بلکہ مسلح عوامی ملیشیا۔

4۔بتدریج تمام انتظامی امور میں سب کو شریک کیا جائے گا۔''ایک باورچی بھی وزیراعظم بننے کا اہل ہوگا،ہر ایک اپنی جگہ افسر ہوگا یعنی کوئی بھی افسر نہیں ہوگا۔''

یہ وہ شرائط تھیں جو لینن نے وضع کی تھیں لیکن جو مکمل سوشلزم یا کمیونزم کیلئے نہیں بلکہ مزدور ریاست کے ابتدائی عرصے کیلئے تھیں یعنی سرمایہ دارانہ نظام سے سوشلزم کی جانب کے عبوری وقت کیلئے۔محنت کشوں اور سپاہیوں کی سوویتوں کے نائبین کی منتخب شدہ اسمبلیاں پیشہ ور سیاستدانوں یا افسر شاہی پر نہیں بلکہ عام مزدوروں،کسانوں اور سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔یہ سماج سے بلندتر کوئی بیگانہ طاقت نہیں تھی بلکہ یہ نیچے عوام سے براہ راست جڑی ہوئی اوران کی چنی ہوئی طاقت تھی۔اس کے قوانین کسی طور بھی ویسے نہیں تھے جیسے ایک سرمایہ دارانہ ریاستی طاقت کی عملداری کے ہوتے ہیں۔یہ اس وقت کی امریکہ اور یورپ کے جدید ترقی یافتہ ملکوں میں موجود بورژوا جمہوریتوں کی طاقت سے قطعی طور پر مختلف تھی۔یہ طاقت 1871ء کے پیرس کمیون جیسی طرز اور نوعیت کی تھی۔یہ درست ہے کہ اس وقت موجود ہولناک پسماندگی،غربت اور ناخواندگی کے باعث روس کا محنت کش طبقہ اس طاقت کو نہیں سنبھال سکتا تھا جو اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔انقلاب کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی جس کے نتیجے میں یہ زوال پذیری کی زد میں آتا گیا اور جو آخر کار سٹالنزم کی شکل میں بدل گیا۔بورژوا مورخین کے دعووٴں کے برعکس سٹالنزم قطعی طور پر بالشوازم کی نہیں بلکہ اس کے بدترین

(c) ketabton.com: The Digital Library

دشمنوں کی پیداوارتھا۔سٹالن کی مارکس اورلینن سے ویسی ہی نسبت تھی جیسی نپولین کی جیکوبنز کے ساتھ یاپوپ کی ابتدائی عیسائیوں کے ساتھ۔ابتدائی سوویت ریاست کسی طور ویسی نہیں تھی جیسا کہ آج کل تاثر دیا جاتا ہے، بلکہ یہ محنت کرنے والے انسانوں کی انقلابی طاقت کا اظہاراور آئینہ دارتھی۔ مارکس کے الفاظ میں اگر اسے بیان کیا جائے تو یہ ایک ''نیم ریاست'' تھی یعنی ایک ایسی ریاست جس نے اپنے ڈیزائن میں ہی بالآخرختم ہو جانا اورسماج میں تحلیل ہو جانا تھا۔جس سے سماج میں اجتماعی نظم ونسق منظّم و مستحکم ہوجاتا جوکہ ہرایک فرد کی بہتری کیلئے کام کرتا،وہ بھی بغیر کسی جبراور دھونس کے۔یہی اور صرف یہی مارکس کا مزدور ریاست کے حوالے سے حقیقی تصور ہے۔

بورژوازی کا ابھار

ٹراٹسکی نے کہاتھا کہ انقلاب،تاریخ کی قوت محرکہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ اٹلی، ہالینڈ، برطانیہ اور پھر فرانس میں بورژوازی کے ابھار کے ساتھ ہی کلچر، آرٹ اور سائنس کو بھی غیر معمولی نشوونما میسر آئی۔ سترہویں اوراٹھارویں صدی میں رونما اور فتح مند ہونے والے بورژوا انقلابات میں پیداواری قوتوں اورٹیکنیک کے ساتھ ساتھ ہی سائنس اور فلسفے میں بھی برابر ترقی ہوتی رہی،جس کی بدولت کلیسا کے نظریاتی تسلط کا خاتمہ ہوگیا۔ان کے مقابلے میں وہ ممالک جہاں جاگیرداری اورکلیسا کی رجعتی طاقتیں نئے سماج کی جڑوں میں پیوست اورچمٹی رہیں وہاں نئے سماج کوتنزلی، انحطاط اور گلنے سڑنے کے طویل مدت کے بیزارکن عمل سے دوچار ہونا پڑا۔ اس حوالے سے سپین کوایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کے ابتدائی ابھار کے دنوں میں، جب یہ نظام تاریخ میں ترقی پسند طاقت کی نمائندگی کر رہاتھا،تو بورژوازی کے ابتدائی نظریہ سازوں کوجاگیرداری کے نظریاتی عناصر کے ساتھ خوفناک جنگ لڑنی پڑی تھی۔اس کا آغاز کیتھولک چرچ سے ہوا۔ جاگیری زمینداری کو اکھاڑ پھینکنے سے بہت پہلے بورژوازی کواپنے سب سے باشعوراور انقلابی نمائندوں کے ذریعے، جاگیرداری کی نظریاتی دفاعی

(c) ketabton.com: The Digital Library

سرحدوں کو توڑنا پڑا تھا۔ یعنی اس فلسفیانہ اور مذہبی فریم ورک کو جو کہ کلیسا کے گرد استوار ہو چکا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ابھار کی ابتدا ہالینڈ اور شمالی اٹلی کے شہروں میں سے ہوئی۔ اس ابھار کے دوران نئے رویے سامنے آئے جس سے نئی اخلاقیات اور نئے مذہبی عقائد پنپتے اور پلتے چلے گئے۔ جاگیردارانہ نظام کے تحت معاشی طاقت اپنا اظہار زمین کی ملکیت کی شکل میں کرتی تھی جبکہ کرنسی کا کردار بہت محدود ہوا کرتا تھا۔ لیکن تجارت، مینوفیکچرنگ کے ابھار اور ان کے ساتھ ہی قائم ہونے والے منڈی کے نوخیز تعلقات نے پیسے کو کہیں زیادہ طاقتور بنا دیا۔ فوگرز جیسے بڑے بینکار خاندان سامنے آئے جو بادشاہ کیلئے چیلنج بنتے چلے گئے۔ سولہویں اور سترہویں صدی کی مذہبی جنگیں، ماسوائے گہرے طبقاتی تضاد کے خارجی اظہار کے اور کچھ نہیں تھیں۔ ان لڑائیوں کا واحد ممکنہ نتیجہ بورژوازی کے اقتدار و اختیار کا ابھار تھا جس سے نئے سرمایہ دارانہ پیداواری رشتے سامنے آتے چلے گئے۔ ان لڑائیوں کی قیادت کو ان کے نتائج کا پہلے سے کوئی ادراک نہیں تھا۔ 60-1640ء کا برطانوی انقلاب ایک بہت بڑی سماجی تبدیلی تھی۔ قدیم جاگیردارانہ حکمرانی کو تباہ کر دیا گیا تھا اور ایک نئے سرمایہ دارانہ سماجی نظام نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ خانہ جنگی ایک طبقاتی لڑائی تھی جس نے چارلس اول کی آمریت اور اس کی پشت پر موجود رجعتی جاگیردارانہ نظم و نسق کو ختم کر ڈالا۔ پارلیمنٹ، شہروں اور ملک بھر میں ابھرتی نئی مڈل کلاس کی نمائندگی کرتی تھی جس نے پرانی حکمرانی کو چیلنج کرتے ہوئے اسے شکست سے دوچار کیا۔ بادشاہ کا سر قلم اور دارالامرا کی عملداری کو ختم کر دیا گیا۔ معروضی حوالے سے اولیور کرامویل برطانیہ میں بورژوازی کے اقتدار کی بنیادیں قائم کر رہا تھا۔ لیکن ایسا کرنے کیلئے اور جاگیردارانہ و کلیسائی گندگی کو صاف کرنے سے پہلے اسے بزدل بورژوازی کو ایک طرف دھکیلنا پڑا، پارلیمنٹ کو تحلیل کرنا پڑا اور اپنی بنیادیں مشرقی انگلینڈ کے چھوٹے کاشتکاروں کی پیٹی بورژوا پرت (جس سے وہ خود تعلق رکھتا تھا) سمیت ملک بھر کے کام کرنے والوں اور نیم پرولتاریہ کے ساتھ استوار کرنی پڑیں۔ اپنے کو ایک انقلابی فوج کی سربراہ کے طور پر براجمان کرتے ہوئے کرامویل کو عوام کی لڑنے کی شکتی کو بروئے کار لانے کیلئے بائبل، پادریوں اور زمین پر خداوند کی سلطنت کے قیام کے نعرے کا سہارا لینا

(c) ketabton.com: The Digital Library

پڑا۔اس کی سپاہ نے کرایہ، منافع اور سود کے نعرے لگاتے ہوئے نہیں بلکہ مذہبی ترانے گاتے ہوئے لڑائی لڑی تھی۔ یہ مقدس روحانیت جلد ہی ایک انقلابی جوش وجذبے سے لیس ہوتی گئی، یہاں تک کہ کچھ موقعوں پر کمیونسٹ انداز بھی اختیار کرتی رہی۔اسی چیز نے ہی عوام کوشاندار جرأت اور ولولے کے ساتھ "Hosts of Baal" کے خلاف لڑائی لڑنے پر تیار کیا۔تاہم کراموپل اقتدار میں آجانے کے بعد تاریخ کے تشکیل کردہ تقاضوں اور اپنے وقت کی پیداواری قوتوں کی معروضی حدود سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔اسے لیفٹ ونگ کے خلاف ہونے پر مجبور ہونا پڑا، لیولرز (Levellers) کو جبراً دبانا پڑ گیا اور ایک ایسی پالیسی اپنانی پڑی جس کے تحت بورژوازی کا ساتھ دیا گیا اور برطانیہ میں سرمایہ دارانہ ملکیت پر مبنی تعلقات کو ازسرنو رائج کرنا پڑا۔آخر میں کراموپل کو پارلیمنٹ تحلیل کرنی پڑی اور اپنی موت تک آمر بن کر حکمرانی کرتا رہا، جب برطانوی بورژوازی کو یہ خوف لاحق ہوگیا کہ انقلاب بہت دور، بہت آگے نکل گیا ہے اور یہ جائیداد کیلئے خطرہ بن سکتا ہے،اس نے اسٹیورٹ کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔

فرانس کا 93-1789ء کا انقلاب معیاری طور پر برطانوی انقلاب سے کہیں بلند تھا۔ جیکوبنز نے مذہب کی بجائے دلیل کو وسیلہ بنایا۔انہوں نے آزادی، برابری اور یگانگت کے نعرے کے تحت لڑائی لڑی تاکہ کام کرنے والوں اور نیم پرولتاریہ کو جاگیردار اشرافیہ اور بادشاہت کے خلاف مزاحمت کیلئے تیار کیا جائے۔باستیل کی ناقابل تسخیر دیواروں کو ڈھانے کے بعد اس انقلاب نے نہ نظر آنے والی اور ناقابلِ تسخیر محسوس ہونے والی کلیسا اور مذہب کی دیواروں کو بھی ڈھا دیا۔لیکن جونہی فرانس کی بورژوازی اقتدار سنبھال چکی تو وہ نوجوان نسل کے ذہنوں میں ڈالی گئی منطق پسندی اور دَہریت کو بھول گئی۔روبس پیری اقتدار کے خاتمے کے بعد جائیداد کے مالکان استحکام پکڑتے چلے گئے۔استحکام کیلئے فارمولے کی تلاش اور ایک قدامت پسند نظریے کیلئے جو کہ ان کی مراعات کو جائز قرار دے سکے، بورژوازی نے جلد ہی مقدس کلیسا کو ازسرنو سینے سے لگا لیا۔کلیسا ویسے بھی حالات میں ڈھل جانے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتا ہے، یہ بے شمار سماجی تبدیلیوں کے باوجود خود کو دو ہزار سالوں سے قائم رکھے آرہا ہے۔کیتھولک کلیسا نے اپنے

(c) ketabton.com: The Digital Library

نئے مالکوں اور محافظوں کو دل وجان سے خوش آمدید کہتے ہوئے بڑے سرمائے کو تقدس فراہم کرنا شروع کر دیا، ویسے ہی جیسے اس نے پہلے جاگیرداروں اور بادشاہوں کو کیا تھا اور اس سے پہلے سلطنتِ روم کو بھی، جو غلاموں کی مالک ہوا کرتی تھی۔

مارکسزم کی بھونڈی تشریح

اپنی کلاسیکل کتاب ''تاریخ کیا ہے'' میں انگریز مورخ ای ایچ کار کہتا ہے کہ ''تاریخی حقائق ہمیشہ اپنے مرتب کرنے والے کے ذہن سے ہو کر سامنے آتے ہیں۔'' وہ مزید کہتا ہے کہ ''آپ کو حقائق کے مطالعے سے پہلے مؤرخ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔'' اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ تاریخ کے بیان کو کسی طور بھی لکھنے اور پڑھنے والے کے سیاسی (یا کسی اور) نکتہ نگاہ اور اس عہد جس میں وہ موجود ہوتے ہیں یا تھے، سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تاریخ کو فاتحین نے مرتب کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی واقعات کا انتخاب اور تشریح، ان تنازعات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں جو مورخ کو متاثر کرتے ہیں جس سے وہ یہ ادراک متعین کرتا ہے کہ اس کا قاری کیا پڑھنا چاہے گا؟ بورژوا مورخین کی کسی مجوزہ معروضیت کے بارے میں تمام تر تعصّبات کے باوجود تاریخ کا لکھا جانا، ناگزیر طور پر ایک طبقے کے نکتہ نگاہ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہوتا ہے کہ بیان کردہ واقعات کے حوالے سے کسی جانبدار رائے سے بچا جائے۔ اس کے برعکس کوئی دعویٰ کرنا قارئین کو دھوکہ دینے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مارکسسٹ جب بھی سماج کو دیکھتے ہیں تو وہ کسی طور بھی غیر جانبدار ہونے کا نہ ارادہ کرتے ہیں نہ دعویٰ۔ وہ کھلے عام محنت کش طبقے کی جدوجہد اور سوشلزم کا پرچار کرتے ہیں۔ تاہم یہ ہمیں کسی طور سائنسی معروضیت سے منع نہیں کرتا۔ ایک حساس آپریشن کرتے وقت کوئی بھی سرجن بھرپور کوشش کرتا ہے کہ وہ مریض کو ہر حالت میں بچا لے۔ وہ نتیجے کے حوالے سے ''غیر جانبداری'' سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ لیکن اس ایک وجہ کیلئے وہ اعضا کی مختلف پرتوں کے معاملے میں انتہائی احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھے گا۔ اسی انداز میں ہی مارکسسٹ سماجی عمل کے ٹھوس تجزیے کیلئے انتہائی سائنسی انداز اپنانے کی بھرپور کوشش کرے گا

(c) ketabton.com: The Digital Library

تا کہ وہ کامیابی کے ساتھ نتیجے پر اثر انداز ہونے کے قابل ہو سکے۔

لیکن اس وقت یہاں ہم کسی طور ایک کے بعد سامنے آنے والے دوسرے حقائق پر مبنی سلسلۂ واقعات کا ذکر نہیں کر رہے بلکہ ہمارا مطمعٔ نظر عمومی عمل کا جائزہ لینا ہے جو ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے کا باعث بنتا اور ان کی وضاحت کرتا ہے۔ اسی سے ہم تاریخ کے بہاؤ اور اس کی سمت کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ بھی کہ کیسے یکے بعد دیگرے مختلف سماجی طبقات کی جدوجہد یں سماج کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس بہاؤ میں سے باہم متصادم طبقات کیا نتائج حاصل کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر کوششیں کی گئی ہیں کہ مارکسزم کا، اس کے تاریخی تجزیے کے طریق کار کے حوالے سے مذاق اڑایا جائے۔ عام طور پر مارکس اور اینگلز کے بارے جو بیہودگی کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں نے ہر شے اور ہر بات کو محض معیشت تک محدود کیے رکھا ہے۔ اس نامعقولیت کا جواب مارکس اور اینگلز نے بارہا دیا۔ جیسا کہ اینگلز کے بلوخ کے نام خط سے واضح ہو جاتا ہے:

''تاریخ کے مادی تصور کے مطابق، تاریخ کا سب سے متعین عنصر زندگی کی پیدائش اور جنم ہے۔ اس سے زیادہ نہ مارکس نے اور نہ میں نے کبھی کچھ کہا۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی بار بار یہ کہتا ہے کہ صرف معیشت ہی واحد متعین عنصر ہوتا ہے تو اس کا بیان سوائے بے معنویت، تجرید اور نادانی کے کچھ نہیں۔''

تاریخی مادیت کا مطلق پن سے کوئی سروکار نہیں۔ مرد و زن اندھی تاریخی قوتوں کی کٹھ پتلیاں نہیں ہوا کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یکسر آزاد عامل بھی نہیں ہوتے کہ خود کو درپیش معاشی ترقی، سائنس اور ٹیکنیک کے مسلط کردہ معروضی حالات (کہ جو آخری تجزیے میں کسی بھی سماجی معاشی نظام کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کا تعین کرتے ہیں) کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی قسمتیں خود ہی تشکیل دیتے رہیں۔ اینگلز کے مطابق:

''انسان اپنی تاریخ خود ہی بناتے ہیں خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی برآمد ہو۔ اس دوران ہر فرد اپنی حتمی شعوری خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اس طرح بہت سی خواہشیں مختلف سمتوں اور جہتوں

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں کام کر رہی ہوتی ہیں اور جن کے بدیہی اثرات خارجی دنیا پر مرتب ہوتے ہیں اور انہی تمام اثرات کے ملاپ کے نتیجے میں تاریخ مرتب ہوتی ہے۔'' (لڈوگ فیور باخ)

مارکس اور اینگلز نے کئی بار اس بات پر تنقید کی کہ کچھ لوگ مصنوعی انداز میں تاریخی مادیت کو غلط استعمال کر رہے ہیں۔ کونراڈ شمٹ کو 5 اگست 1890ء کو لکھے گئے اپنے خط میں اینگلز نے کہا:

''عام طور پر لفظ ''مادیت'' کو جرمنی کے نوجوان لکھاری جیسے دل چاہے، اپنے جملوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ہر بات کو بغیر کسی وسیع مطالعے کے لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ محض لفظ سے چپک کے رہ جاتے ہیں اور پھر یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ انہوں نے مسئلہ ہی حل کر دیا ہے۔ لیکن اس سب سے ہٹ کے ہمارا تاریخ کا تصور، ہیگل کو ماننے والوں کی طرح تعمیر کرنے کا کوئی اوزار نہیں، بلکہ مطالعے کیلئے گائیڈ کا ہے۔ ساری تاریخ کو تروتازگی سے پڑھا جانا چاہیے۔ سماج کی مختلف شکلوں کے وجود کی شرائط کو انفرادی طور پر دیکھا جائے، اس سے پہلے کہ انہیں ان سے متعلق سیاسی، سماجی قانون، جمالیات، فلسفے، مذہب وغیرہ کے نکتہ نگاہ سے جانچا اور اخذ کیا جائے۔ اس بارے میں اب تک بہت ہی کم کام ہوا ہے کیونکہ بہت ہی کم لوگوں نے اس پر سنجیدگی سے توجہ دی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت سی مدد مل سکتی ہے۔ جو کوئی بھی اس کیلئے سنجیدگی سے کام کرے گا وہ نہ صرف بہت کچھ حاصل کر سکے گا بلکہ وہ ممتاز بھی ٹھہرے گا۔ لیکن ایسا کرنے کی بجائے جرمن نوجوانوں کی بڑی تعدا تاریخی مادیت کو محض اپنے محدود تاریخی علم میں جملے بازی کیلئے استعمال کرتی ہے (ویسے تو کسی بھی چیز کو جملوں تک محدود کیا جا سکتا ہے)۔۔۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی تو معاشیات کی تاریخ نوخیز ہے اور اسے بہت جلد ایک شفاف نظام کے طور پر تعمیر کر دیا گیا ہے، اس کے بعد یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت بڑا کام کر دیا ہے۔ پھر کچھ وقت کے بعد 'بارتھ' جیسے مورخ بیچ میں آتے ہیں اور جس عمل کو سطحی جملوں تک محدود کر دیا گیا ہے اس پر حملے کر کے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔'' (مارکس اینگلز، مجموعی تصانیف، جلد نمبر 49، صفحہ 8)

کونراڈ شمٹ کو ہی اپنے 27 اکتوبر 1890ء کے خط میں اینگلز لکھتا ہے:

(c) ketabton.com: The Digital Library

''ان صاحبان کے ساتھ جو سب سے بڑی دشواری ہے ،وہ جدلیات سے ان کا نابلد ہونا ہے۔انہیں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا،ان کو یہاں وجہ نظر آتی ہے اور وہاں نتیجہ۔یہ محض ایک خالی تجرید ہے،اس قسم کا مابعدالطبیعاتی تضاد حقیقی دنیا میں اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ جب بحران عروج پر ہوں، جب سارا وسیع عمل، باہمی تعامل کی صورت میں کام کرر ہا ہوتا ہے (اگر چہ یہ مختلف نابرابر قوتوں پر مبنی ہوتا ہے، معاشی تحریک بہت دور ہوتی ہے لیکن جو مضبوط ترین، سب سے بنیادی اور سب سے زیادہ فیصلہ کن ہوتی ہے)، یہاں ہر شے اضافی ہے اور کچھ بھی مطلق نہیں ہے۔۔۔ ایسا دیکھنا انہوں نے شروع ہی نہیں کیا ہے۔لگتا ہے کہ ہیگل ان کیلئے وجود ہی نہیں رکھتا۔'' (مارکس اینگلز، مجموعی تصانیف، جلد نمبر 49 صفحہ 59)

مارکسزم نظریات کے سوال سے انکار نہیں کرتا لیکن وہ یہ دیکھتا اور جانچتا ہے کہ یہ کیسے سامنے آتے اور ابھرتے ہیں۔اسی طرح سے یہ فرد کے کردار سے بھی انکار نہیں کرتا اور بالکل ایسے ہی اتفاقات سے بھی۔تاہم مارکسزم ان سب کو ان کے درست سیاق وسباق میں دیکھتا ہے۔کار کا ایک حادثہ یا کوئی ایک گولی بھی بلاشبہ تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتی ہے لیکن انہیں کسی طور بھی قوت محرکہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ہیگل نے کہا تھا کہ ضرورت اپنا اظہار حادثے (اتفاق) کی صورت میں کرتی ہے۔پہلی عالمی جنگ کا باعث بننے والی سرائیوو (موجودہ بوسنیا کا دارالحکومت) میں آرک ڈیوک فرڈیننڈ کی جان لینے والی گولی ایک تاریخی حادثہ تھی جو کہ بڑی طاقتوں کے درمیان دشمنی کا عمل انگیز ثابت ہوئی ،لیکن یہ دشمنی 1914ء سے پہلے ہی بڑی یورپی طاقتوں کے مابین ناقابل حل معاشی، سیاسی اور عسکری تضادات کی صورت میں پنپ رہی تھی۔

مارکسی فلسفہ

یہاں ہمارے سامنے بنیادی سوال آتا ہے کہ مارکسی فلسفہ کیا ہے! مارکس اور اینگلز کی تحریروں میں ہمیں کوئی فلسفیانہ نظام نہیں ملتا جیسا کہ ہیگل کے ہاں ہے۔تاہم ہمیں ان میں اعلیٰ پیمانے کی بصیرت اور اشارے ضرور میسر آتے ہیں کہ جنہیں اگر باقاعدہ مرتب کیا جاتا تو یہ سائنسی

(c) ketabton.com: The Digital Library

طریق کار کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوتا۔ بدقسمتی سے ایسا کوئی کام سنجیدگی سے نہیں کیا گیا۔ جو کوئی بھی جدلیاتی مادیت کو گہرائی میں اور تفصیل سے پڑھنا چاہتا ہے، اسے بہت مشکل پیش آتی ہے۔ موضوع کی حد درجہ اہمیت کے باوجود، مارکس اور اینگلز کی کوئی ایک کتاب بھی نہیں ہے جو اس سوال کو جامع انداز میں بیان کرتی ہو۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مارکس کی سبھی تحریروں میں جدلیاتی طریق کار بالکل واضح صورت میں موجود ہے۔ شاید ہی کسی مخصوص شعبے میں جدلیات کے اطلاق کی اس سے بہتر اور کوئی مثال موجود ہو۔ یہاں ہم سیاسی معاشیات کا بطور خاص ذکر کریں گے جو کہ ''سرمایہ'' کی تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایک لمبا عرصا مارکس نے بھرپور کوشش بھی کی تھی کہ جدلیاتی مادیت پر کتاب لکھے لیکن وہ ''سرمایہ'' پر کام کی وجہ سے ایسا نہیں کر پایا۔ اس بہت بڑی اور بھاری ذمہ داری کے علاوہ مارکس نے لاتعداد سیاسی تحریریں بھی لکھیں، ساتھ ہی وہ مزدور تحریک میں بھی سرگرم رہا، خاص طور پر انٹرنیشنل ورکنگ مین ایسوسی ایشن (پہلی انٹرنیشنل) کی تعمیر و تشکیل میں گرمجوشی سے شریک رہا۔ ان سرگرمیوں اور ذمہ داریوں نے اس کی زندگی کا ہر لمحہ کھپائے رکھا۔ اس کے بدترین معاشی حالات، ناموزوں خوراک اور بیزاری کی وجہ سے اس کی صحت بگڑ چکی تھی۔ مارکس کی وفات کے بعد اینگلز نے فلسفے پر لکھنے کی منصوبہ بندی کی، یہ کام اس کا عزیز دوست نہ کر سکا تھا۔ اینگلز نے ہمارے لئے مارکسی فلسفے کے حوالے سے کئی نادر و نایاب تحریریں چھوڑی ہیں جن میں لڈوگ فیورباخ اور کلاسیکل جرمن فلسفے کا اختتام، انٹی ڈیوہرنگ اور فطرت کی جدلیات شامل ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اینگلز بھی کئی ایک وجوہات کی بنا پر مارکسی فلسفے پر کوئی حتمی کتاب نہیں لکھ پایا۔ پہلے تو اسے جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر ایک موقع پرست رجحان کے ابھار نے مجبور کیا کہ وہ اپنے سائنسی تحقیق کے کام کو ایک طرف رکھتے ہوئے موقع پرستی کے خلاف ایک مدلل مضمون لکھ سکے، جو کہ اب مارکسزم کے اہم ترین کلاسیکی کاموں میں سے ایک ہے۔ یہ مشہورِ زمانہ کتاب انٹی ڈیوہرنگ ہے جو باقی امور کے علاوہ مارکسی فلسفے کا ابتدائی اہم کام ہے۔ بعد ازاں اینگلز دوبارہ اپنے مطالعے کی طرف راغب ہوا تا کہ فلسفے پر ایک جامع کتاب کی تیاری کر سکے۔ لیکن مارچ 1883ء میں مارکس کی وفات کے بعد ایک بار پھر

(c) ketabton.com: The Digital Library

اینگلز کو ''سرمایہ'' کی دوسری اور تیسری جلدوں کے بکھرے ہوئے مشکل کام کو دیکھنا اور اسے ترتیب دینا پڑ گیا۔ جسے مارکس مکمل نہیں کر پایا تھا۔

مارکس اور ہیگل

جدلیاتی فلسفے کو جرمن خیال پرست جارج ہیگل کے فلسفے کی صورت میں بلند ترین عروج حاصل ہوا۔ ہیگل کا سب سے بڑا کارنامہ جدلیات کی دریافت تھی جو کہ دراصل یونانیوں کی ایجاد تھی۔ ہیگل نے اسے نئی بلندیاں فراہم کیں۔ لیکن اس نے یہ سب خیال پرستانہ طریقے سے کیا۔ اینگلز کے الفاظ میں یہ تاریخ کا سب سے بڑا اسقاط حمل تھا۔ ہیگل کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو ایک حقیقی عظیم تصور کا ادراک ہوتا ہے جو کہ ایک خیال پرستانہ تصوف کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ یہاں ہمیں غیر معمولی کامل تصورات کی ایک دنیا ملتی ہے، بصیرت کا ایک حیرت کدہ ہے لیکن یہ سب ایک خیال پرستانہ پراگندگی کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ہیگل کا مطالعہ حواس کو بوکھلا دینے والا تجربہ ہے۔ بار بار یہ عظیم مفکر، چکرا دینے کی حد تک، مادیت پرستانہ پوزیشن کے انتہائی قریب بھی پہنچا لیکن عین آخر میں وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے، شاید کسی فساد کے خوف سے۔ اس وجہ سے ہیگیلین فلسفہ نامطمئن، تضادات سے بھرپور، مضمحل اور نامکمل رہا۔ یہ کام مارکس اور اینگلز نے اپنے سر لیا کہ ہیگل کے فلسفے کے نکات کے بیچ موجود ادھورپن اور پیچیدگیوں کو دور کرتے ہوئے اس کے فلسفے کو اس کے منطقی انجام تک لے جائیں۔ ایسا کرتے ہوئے نہ صرف اس کی مکمل نفی کرتے جائیں بلکہ اسے معیاری برتری میں بدل دیں۔

ہیگل روایتی فلسفے کو جتنی دور تک لے جا سکتا تھا، لے گیا۔ ایسا کرتے ہوئے ہیگل کو فلسفے کی مروجہ حدود و قیود سے بہت باہر جانا پڑ گیا۔ اس عمل میں فلسفے کی نفی کرنی پڑی۔ فلسفے کو ابہام اور اندیشوں کی دنیا سے مادی اشیا کی حقیقی دنیا، زندہ مرد و زن کی دنیا، حقیقی تاریخ اور اس جدوجہد کی طرف واپس آنا تھا، جس سے یہ بہت وقت پہلے سے کٹا ہوا تھا۔ فیورباخ اور موسس ہیس جیسے بائیں بازو کے دوسرے ہیگیلین مفکروں کے ساتھ مسئلہ یہ ہوا کہ انہوں نے کلیتاً ہیگل کو ''نہ'' کر دی اور اس کے فلسفے کو یکسر مسترد کرتے ہوئے اس کی نفی کر دی۔ اس وقت پروشیائی ریاست کے جبر اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

یورپ میں اس وقت حاوی عمومی رجعتیت کی موجودگی میں ،ہیس کا مادیت پرستی کی طرف بڑھنا ایک دلیرانہ قدم تھا۔اس کیلئے واقعتاً جرأت درکار تھی جس نے اس وقت نوجوان مارکس اور اینگلز کو بہت متاثر کیا۔لیکن آخر کار اسے بھی ناکامی ہوئی۔کوئی بھی گندم کے دانے کو مسل کے اس کی نفی کر سکتا ہے۔لیکن جدلیاتی نفی کا یہ نظریہ نہیں ہے کہ کسی شے کو تباہ کر دیا جائے۔یہ نظریہ اسے مٹاتا تو ہے لیکن اسی دوران یہ ہر اس شے کو محفوظ بھی رکھتا ہے جو محفوظ رکھنے کی مستحق ہوتی ہے۔اگر گندم کے دانے کو مٹی میں دبا دیا جائے تو یہ بھی دانے کی نفی ہو سکتی ہے۔ ہیگل نے نشاندہی کی تھی کہ ایک بچے کے منہ سے نکلنے والے وہ الفاظ جو کہ ایک جہاندیدہ بوڑھے کے منہ سے بھی نکلتے ہوں، برابر کے وزن کے حامل نہیں ہو سکتے کیونکہ بوڑھے نے زندگی گزاری ہوتی ہے اور وہ بڑے تجربات سے مالا مال بھی ہوتا ہے۔یہی معاملہ فلسفے کے ساتھ ہے۔اپنے ابتدائی مقام کی طرف پلٹنے سے پہلے فلسفے کو طے شدہ دور دراز کے مراحل کا اعادہ نہیں کرنا پڑتا۔ اپنی بزرگی سے اپنی طفولیت کی جانب جاتے ہوئے اسے بچہ نہیں بننا پڑتا بلکہ اسے دوہزار سالہ تاریخ اور سائنس و تکنیک کی ترقی کے دامن میں سے ہوتے ہوئے عظیم یونانیوں کے قدیم نظریات تک جانا پڑتا ہے۔یہ کسی طور کسی بڑے پہیے کی مکینیکل حرکت جیسا عمل نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ بیتے ہوئے مراحل کی بیہودہ تکرار ہوتی ہے، جیسا کہ نہ ختم ہونے والے جنم کا عمل جو کہ مشرقی مذاہب میں بیان کیا جاتا ہے۔یہ نفی کی نفی ہوتی ہے جو اپنا اثبات ترقی کی ایک اور ابتدائی شکل میں کرتی ہے لیکن ایک بلند پیمانے کی مہارت کے ساتھ۔یہ ایک سی ہو کر بھی ایک سی نہیں ہوتی۔

تاہم، اگرچہ کچھ گہرے اور اہم نتائج تک پہنچنے اور مادیت پرستی کے قریب تر ہونے کے باوجود (مثال کے طور پر اپنی کتاب ''فلسفے کی تاریخ'' میں) ہیگل اپنے خیال پرستانہ نکتہ نگاہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکا۔اس نے اپنے جدلیاتی طریقے کو کبھی بھی فطرت اور سماج کی حقیقی دنیا کے ساتھ درست طور پر جوڑنے کا تردد ہی نہیں کیا کیونکہ اس کے نزدیک حقیقی ترقی صرف تصورات کی دنیا کی ترقی ہی تھی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مارکس کا فلسفیانہ انقلاب

مارکس کی سبھی تھیوریوں میں سے سب سے زیادہ جس تھیوری کو تنقید، تضحیک اور تذلیل کا سامنا کرنا پڑا وہ جدلیاتی مادیت ہے۔ یہ کوئی اتفاق بھی نہیں ہے کیونکہ یہی مارکسزم کی اصل اساس ہے۔ یہ کم وبیش سائنسی سوشلزم کا طریق کار ہے۔ مارکسزم صرف ایک سیاسی پروگرام اور ایک معاشی نظریے کا ہی نام نہیں بلکہ بہت کچھ ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو اپنی وسعت میں صرف سیاست اور طبقاتی جدوجہد کا ہی نہیں بلکہ ساری انسانی تاریخ، معیشت، سماج، افکار اور فطرت کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ آج بورژوازی کا نظریہ انتشار کی زد میں ہے، نہ صرف معیشت اور سیاست میں بلکہ فلسفے کے میدان میں بھی۔ اپنے شباب کے دنوں میں بورژوازی، ہیگل اور کانٹ جیسے عظیم مفکر پیدا کر رہی تھی۔ اب اپنے شدید زوال کی کیفیت میں کچھ بھی ڈھنگ کا پیدا نہیں کر رہی۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ یونیورسٹیوں کے فلسفے کے شعبوں کی بانجھ تحریریں پڑھیں اور آپ کے اندر بیک وقت چڑچڑاہٹ اور پژمردگی نہ پیدا ہو جائے۔

حکمران طبقات کے خلاف لڑائی صرف کارخانوں، سڑکوں، پارلیمنٹوں یا لوکل کونسلوں تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ہمیں اسے نظریات کے میدان میں بھی لڑنا ہوتا ہے، جہاں بورژوازی کے تباہ کن مضر اثرات کسی اور شعبے سے کم نہیں ہوتے اور جو مکروہ غیر جانبداری اور مصنوعی معروضیت کے پردوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ مارکسزم کا یہ فرض بنتا ہے کہ یہ پرانے اور فرسودہ ہو چکے منصبوں کا متبادل پیش کرے۔ اپنی جوانی میں ہی مارکس، ہیگل کے فلسفے سے شدید متاثر ہوا تھا جس نے اس وقت جرمنی کی یونیورسٹیوں کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ ہیگل کا سارا نکتہ نگاہ اس بات پر مرکوز تھا کہ صرف تبدیلی کو ثبات حاصل ہے اور ترقی تضادات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے یہ فلسفے میں ایک حقیقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ اس متحرک انقلابی صفت نے نوجوان مارکس کو متاثر کیا اور یہی آگے چل کر اس کے نظریات کی شروعات کا سبب بھی بنی۔

مارکس اور اینگلز دونوں نے ہیگل کی نفی کی اور اس کے تصورات کے نظام کو اس کے الٹ میں بدل ڈالا۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے دونوں نے تواتر اور تردد کے ساتھ ہیگل کے فلسفے کے قابلِ

(c) ketabton.com: The Digital Library

قدر حصوں کو محفوظ رکھا۔ وہ خود کو ہیگل کے فلسفے کا "مدلل نگہبان" بناتے ہوئے ان تصورات کو بہت بلند سطح پر لے گئے اور انہیں ترقی دیتے ہوئے حقیقی مواد سے آشکار کیا جو کہ ان کے اندر پہلے سے موجود تھا۔ ہیگل میں تاریخی قوتوں کی حقیقی جدوجہد اپنا اظہار تصورات کی جدوجہد کی مبہم شکل میں کرتی ہے۔ لیکن جیسا کہ مارکس کہتا ہے کہ نظریات اپنے اندر کوئی تاریخ نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کا حقیقی وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ہیگل کے یہاں حقیقت، ایک تصوفانہ و بیگانہ صورت میں ملتی ہے۔ فیور باخ کے معاملے میں بھی معاملات کچھ بہتر نہیں کیونکہ اس کے ہاں بھی انسان ایک یکطرفہ، خیال پرستانہ اور غیر حقیقی کیفیت میں موجود ہے۔ صرف مارکسی فلسفے کی دنیا میں ہی مرد و زن حقیقی اور تاریخی طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

مارکس کے فلسفے سے کم از کم یہ تو ہوا کہ فلسفہ بالآخر اپنی جڑوں پر استوار ہو گیا۔ یعنی جدلیات اور مادیت، دونوں سے۔ یہاں نظریہ اور عمل ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے اور خوشی مناتے ملتے ہیں اور فلسفہ ایک تاریک اور بے آواز مطالعے سے باہر نکل کر دھوپ اور ہوا سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا ناقابل تنسیخ جزو بن جاتا ہے۔ کسی وجود کے بغیر نظریات کے مبہم تنازعے کی جگہ ہمیں مادی دنیا اور سماج کے حقیقی تضادات سے واسطہ پڑتا ہے۔ حقیقت سے بالاتر دھندلے خیالات کے مابین تضاد کی بجائے ہمیں زندہ مرد و زن سے پالا پڑتا ہے جو حقیقی سماج میں جی رہے ہیں، حقیقی تاریخ مرتب کر رہے ہیں اور حقیقی لڑائیاں بھی لڑ رہے ہیں۔

ہیگل کے یہاں جدلیات ایک سحر انگیزی اور نیم صوفیانہ انداز میں کارفرما ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ "سر کے بل کھڑی ہے۔" ہمیں یہاں سماج اور فطرت میں کارفرما حقیقی عوامل نہیں ملتے بلکہ اس کی بجائے یہاں ہمیں کچھ انسانوں، خاص طور پر فلسفیوں، کے دماغوں میں تیرتے تصورات کے جھلملاتے عکس نظر آتے ہیں۔ اینگلز کے الفاظ میں جدلیات ہیگل کے ہاتھوں اس کے نابغہ ہونے کے باوجود بھی ایک بڑے اسقاط کا شکار ہو گئی۔ ہیگل کی جدلیات کو مارکس نے آ کر بچایا۔ اینگلز کے مطابق صرف مارکس ہی تھا جس نے ہیگل کی منطق میں بند تصوف کو نکال باہر کیا اور اس میں موجود جدلیات کے جوہر کو سامنے

(c) ketabton.com: The Digital Library

لے آیا۔اس شعبے میں یہ مارکس کی حقیقی دریافت تھی۔

مارکس نے جدلیاتی طریق کارکواز سرنو تعمیر کرتے ہوئے تصورات کو درست طور پر ترقی دی، جبکہ ہیگل کا فلسفہ اشیا کی وضاحت دماغ یا پھر آفاقی روح کے نکتہ نگاہ (یعنی خیال پرستانہ طریقے) سے کرتا ہے۔مارکس نے یہ دکھایا کہ انسانوں کے ذہنوں میں تصورات کی ترقی، سماج اور فطرت میں وقوع پذیر ہوتی ترقی ہی کی عکاس ہوتی ہے۔جیسا کہ مارکس کہتا ہے ''ہیگل کی جدلیات، ہر نوع کی جدلیات کی بنیاد ہے،لیکن صرف اسے اس کی تصوفانہ ہیئت سے نکالنا ہی میرے طریق کار کو منفرد اور ممتاز بناتا ہے۔''(کوگل مین کے نام خط،6مارچ 1868ء؛ مجموعی تصانیف؛جلد15؛صفحہ 543)

جدلیات کیا ہے؟

ٹراٹسکی نے اپنے مختصر مگر شاندار مضمون ''جدلیاتی مادیت کی ابجد'' میں جدلیات کی تعریف کچھ یوں بیان کی ہے:

''جدلیات نہ تو کوئی افسانہ نگاری ہے نہ تصوف، بلکہ یہ ہمارے سوچنے کے طریقوں کی سائنس ہے اور یہ روزمرہ زندگی کے مسائل تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ یہ کوشش کرتی ہے کہ دور دراز کے اور پیچیدہ تر معاملات کا ادراک بھی کرلیا جائے۔جدلیات اور رسمی منطق کا آپس میں وہی تعلق ہے جو سادہ ریاضی اور پیچیدہ ریاضی کے مابین ہوتا ہے۔''

جدلیاتی طریق کار نے مادیت کے ساتھ مل کر ایک انتہائی موثر اور طاقتور تجزیاتی اوزار تخلیق کیا ہے۔لیکن یہ جدلیات ہے کیا؟ یہاں موقع نہیں کہ ہیگل کی تشکیل کردہ اور مارکس کی تکمیل کردہ جدلیات کے سبھی قوانین کو بیان کیا جائے۔میں (راقم الحروف) نے اس پر اپنی کتاب ''مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس'' میں حد درجہ سیر حاصل بحث کی ہے۔البتہ یہاں میں اسے چند فقروں میں واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔اپنی کتاب ''انٹی ڈیوہرنگ'' میں اینگلز نے اسے کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ''جدلیات، سادہ طور پر انسانی سماج،فطرت،تصورات کی ترقی اور حرکت کے عمومی قوانین کی سائنس ہے۔'' اپنی کتاب ''فطرت کی جدلیات'' میں اینگلز نے جدلیات کے بنیادی قوانین

(c) ketabton.com: The Digital Library

کا خاکہ اس طرح پیش کیا ہے:

1۔مقدار کی معیار میں تبدیلی کا قانون۔

2۔ضدین کے مابین جدل اور اتحاد کا قانون اور اپنی انتہاؤں پر پہنچ کر ان کا تبدیل ہو جانا۔

3۔تضادات کے ذریعے ترقی کا قانون یعنی نفی کی نفی۔

اپنی نامکمل اور تشنہ طلب حالت کے باوجود اینگلز کی کتاب ''فطرت کی جدلیات'' مارکسزم کے طالبعلموں کیلئے ''اینٹی ڈیوہرنگ'' کی طرح بہت اہم ہے۔ بلاشبہ اینگلز کو اپنے زمانے کی سائنسی ایجادات اور علم سے ہی استفادہ کرنا تھا، تاہم یقینی طور پر اینگلز کے مواد کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔لیکن ''فطرت کی جدلیات'' کے حوالے سے جو بات حیران کن ہے، وہ یہ تفصیل یا وہ حقائق نہیں جنہیں سائنس کی پیش قدمی پیچھے چھوڑ گئی ہے۔اس کے برعکس زیادہ حیران کن بات اینگلز کی وہ جدید نظریاتی پوزیشنیں ہیں جن میں سے اکثر اس کے اپنے ہی عہد کی سائنسی تھیوریوں سے متصادم تھیں، لیکن جنہیں آج کی جدید سائنس نے اپنا لیا ہے۔اپنی پوری کتاب میں اینگلز نے اپنے اس نظریے پر زور دیا ہے کہ مادہ اور حرکت (جسے اب ہم توانائی کہتے ہیں) ناقابل علیحدگی ہیں۔حرکت، مادے کے وجود کی طرز (Mode) ہوتی ہے۔ مادے کا حرکیاتی تصور ایک ایسی حتمی سچائی ہے، جسے یونان کے ابتدائی فلسفیوں کی جانب سے کم وبیش سمجھ لیا گیا تھا یا جس کا اندازہ لگایا جا چکا تھا۔مثلاً ہیراقلیطس کہتا ہے کہ ''ہر شے ہے بھی اور نہیں بھی، کیونکہ ہر شے بہاؤ میں ہے۔'' ہر شے مستقلاً تبدیل ہو رہی ہے، وجود پا رہی ہے اور گذرتی جا رہی ہے۔

عام عقل کے مطابق کسی شے کی کمیت مستقل رہتی ہے۔مثال کے طور پر ایک گھومتے ہوئے لٹو کی کمیت اتنی ہی رہتی ہے جتنی اس کی بغیر حرکت کی حالت میں ہوتی ہے۔چنانچہ اسے رفتار سے الگ تھلگ ''ثابت'' سمجھا جاتا رہا۔ بعدازاں یہ دریافت ہو گیا کہ یہ غلط ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کمیت بڑھ جاتی ہے لیکن یہ اضافہ اسی حالت میں ہی معلوم پڑتا ہے کہ جب حرکت روشنی کی رفتار جتنی ہو۔روزمرہ کے عملی مقاصد کیلئے ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ کمیت مستقل رہتی ہے قطع نظر کہ اس کی حرکت کی رفتار کیا ہے۔تاہم رفتار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بیان غلط ہوتا جائے گا۔اس

(c) ketabton.com: The Digital Library

قانون کے بارے میں پروفیسر فین مین کا کہنا ہے:

''۔۔۔فلسفیانہ طور پر ہم اس عام قانون بارے بالکل غلطی پر ہیں۔دنیا بارے ہماری پوری تصویر بدل کے رہ جاتی ہے جب کمیت میں ایک معمولی سی تبدیلی بھی واقع ہوتی ہے۔قوانین کے پیچھے فلسفے یا تصورات کے حوالے سے یہ بات بہت ہی شاذونادر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک بہت ہی چھوٹا سا اثر بھی بعض اوقات ہمارے تصورات میں مکمل تبدیلی کا متقاضی ہوجاتا ہے۔''

(پروفیسر رچرڈ فین مین،طبیعات پر لیکچرز)

یہ واضح مثال ابتدائی مکینکس اور ایڈوانس ماڈرن فزکس میں بنیادی فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح ابتدائی ریاضی میں، جو کہ روزمرہ کے سادہ حساب کتاب میں استعمال ہوتا ہے، اور اعلیٰ درجے کے ریاضی میں بہت فرق ہے جس کا ذکر اینگلز نے ''انٹی ڈیوہرنگ'' اور'' فطرت کی جدلیات'' میں کیا ہے۔ایسا ہی فرق رسمی منطق اور جدلیات میں بھی ہوتا ہے۔روزمرہ زندگی کے لئے رسمی منطق کافی ہے۔تاہم بہت ہی پیچیدہ کیفیات میں یہ قوانین الٹ پلٹ اور اوپر نیچے بھی ہوتے رہتے ہیں اور یوں ان کی محدود سچائی غلط ہوجاتی ہے۔

مقدار اور معیار

جدلیاتی مادیت کے نکتہ نگاہ سے مادی دنیا کا نہ تو کوئی شروع ہے نہ ہی کوئی انت،لیکن یہ مادے (یا توانائی) کے ایک ایسے بڑے حجم پر مشتمل ہے جو مسلسل حرکت کی حالت میں ہے۔ مارکسی فلسفے کا بنیادی تصور یہی ہے اور جس کی، پچھلے ایک سو سالوں سے جدید سائنس کی دریافتیں مسلسل تائید کرتی آرہی ہیں۔روزمرہ کی زندگی سے کسی بظاہر مستحکم مظہر کی کوئی مثال لے لیجیے،ہم دیکھ سکیں گے کہ سطح کے نیچے کیسے تبدیلی واقع ہورہی ہوتی ہے،اگرچہ یہ تبدیلی پہلی نظر میں نظر نہیں آتی۔مثال کے طور پر ہم پانی کا ایک گلاس لیتے ہیں،''ہماری آنکھیں،جی ہاں ہماری کٹھور آنکھیں کوئی تبدیلی نہیں دیکھ رہی ہوتیں لیکن اگر ہماری نظر ایک ارب گنا تیز ہوجائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارے اپنے نکتہ نگاہ سے مسلسل تبدیلیاں ہورہی ہیں۔مالیکیول ہر لحظہ اپنی جگہ تبدیل کررہے ہیں، سطح کو چھوڑ رہے ہیں اور پھر واپس آرہے ہیں۔'' (پروفیسر رچرڈ فین مین،طبیعات پر لیکچرز؛

(c) ketabton.com: The Digital Library

باب 1 صفحہ 18)

یہ الفاظ اینگلز کے نہیں ہیں بلکہ ایک معروف سائنسدان کے ہیں جو کیلیفورنیا انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں نظریاتی فزکس پڑھاتا رہا ہے۔ یہی مصنف، اینگلز کی مشہور مثال مقدار کی معیار میں تبدیلی کو دہراتا ہے۔ پانی، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایٹموں کی مسلسل حرکت سے مل کر بنتا ہے۔ پانی اپنے مالیکیولوں کے اس باہمی تعامل کے دوران ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اسے 100 درجہ سنٹی گریڈ پر نارمل ماحولیاتی دباؤ میں رکھا جائے تو یہ ایک ایسے خاص مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں مالیکیولوں کی ایک دوسرے کو کھینچتی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور وہ اچانک الگ ہو کے اڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ مثال بظاہر عام سی معلوم پڑتی ہے لیکن سائنس اور صنعت کے شعبوں میں انتہائی دوررس اثرات کی حامل ہے۔ یہ جدید فزکس کے ایک بہت ہی اہم شعبے 'عبوری مراحل کے مطالعے' کا ایک جزو ہے۔ مادہ چار مرحلوں یا حالتوں میں ہوتا ہے: ٹھوس، مائع، گیس اور پلازما۔ اسی طرح کچھ اور انتہائی حالتیں بھی ہوتی ہیں جن میں Critical Fluids اور Degenerate Gas شامل ہیں۔

عام طور پر جب ایک ٹھوس کو حرارت دی جاتی ہے (یا جب دباؤ کم ہوتا ہے) تو یہ ایک محلول کی حالت میں بدل جاتا ہے اور پھر گیس بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر برف حرارت ملنے پر پانی بن جاتی ہے اور جب پانی کو گرم کیا جاتا ہے تو یہ بھاپ بن جاتا ہے۔ لیکن پھر اگر اس بھاپ کو ایک انتہائی بلند درجہ حرارت سے گزارا جائے تو مرحلے کی ایک نئی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ 12,000 کیلون یا 11,726.85 سیلسیس درجہ حرارت پر بھاپ پلازما بن جاتا ہے۔ اسی کو مارکسزم مقدار کی معیار میں تبدیلی قرار دیتا ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ معمولی تبدیلیوں کی ایک بڑی تعداد بالآخر ایک معیاری جست پیدا کرتی ہے یعنی حالت کی تبدیلی۔ اس کیلئے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اگر کوئی کسی مادے، مثلاً سیسے یا نیوبیم کو ایک مخصوص درجہ حرارت تک ٹھنڈا کرے تو اس کی الیکٹریکل مزاحمت کم ہوتی چلی جائے گی، 273- سنٹی گریڈ سے کچھ زیادہ کے درجہ حرارت پر پہنچنے کے بعد مزاحمت اچانک غائب ہو جائے گی۔ یہاں ایک ''کوانٹم جست'' جیسی کیفیت

(c) ketabton.com: The Digital Library

سامنے آتی ہے، ایک معمولی مزاحمت سے عدم مزاحمت کی طرف عبور۔

کوئی بھی شخص سبھی فطری سائنسوں میں اس کی بے شمار مثالیں ڈھونڈ سکتا ہے۔امریکی سائنسدان مارک بوچانن نے ''Ubiquity'' کے نام سے ایک انتہائی دلچسپ کتاب لکھی ہے جس میں اس نے ان گنت مثالیں پیش کی ہیں جیسے دل کے دورے، جنگلوں میں لگنے والی آگ، تباہیاں، جانوروں کی آبادی میں اضافہ اور کمی، سٹاک ایکسچینجوں کے بحران، یہاں تک کہ فیشن اور مختلف شعبہ ہائے فنون میں ہونے والی تبدیلیاں (میں ان میں انقلابات کا اضافہ کرنا چاہوں گا)۔۔۔ان سب چیزوں کا بظاہر آپس میں کوئی تال میل نظر نہیں آتا۔اس کے باوجود یہ ایک ہی قانون سے منسلک ہیں جس کو ریاضی کی ایک مساوات سے بیان کیا جاسکتا ہے، جسے طاقت کا قانون(Power Law) کہا جاتا ہے۔ مارکسی اصطلاح میں اسے مقدار کی معیار میں تبدیلی کا قانون کہتے ہیں اور یہ سارا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ قانون ہر جگہ موجود ہے۔یعنی یہ کائنات میں ہر سطح پر موجود ہے چنانچہ یہ اینگلز کے بقول ایک حقیقی عالمگیر قانون ہے۔

جدلیات بمقابلہ تجربیت (Empiricism)

''ہمیں حقائق دیے جائیں!'' کسی شاہی فرمان جیسا یہ مطالبہ حقیقی عملیت پسندوں کی جانب سے پیش کیا جاتا ہے۔ بھلا اور کیا حقائق ان کے سامنے لا کے رکھے جائیں! جو بھی کچھ حقیقت کی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے، جلد ہی اپنے الٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ایک وقت میں جو حقائق مستند ہوتے ہیں وہ کسی وقت بھی پہلے سے بہت مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہر شے مستقل تبدیلی کی حالت میں ہے اور جلد یا بدیر ہر شے اپنے الٹ میں بدل جاتی ہے۔ جو ٹھوس نظر آ رہی ہوتی ہے وہ ہوا ہو جاتی ہے۔

جدلیاتی طریقہ ہمیں اجازت دیتا ہے کہ ہم ظاہر سے آگے اور سطح کے نیچے موجود بھی دیکھ سکیں۔ یہ عوامل و مظاہر کا جامع اور متحرک نکتہ نگاہ پیش کرتا ہے۔ جدلیات اشیا کا تجزیہ ان کے تعلقات میں کرتی ہے نہ کہ علیحدگی میں۔انہیں ان کی حرکت میں دیکھتی ہے نہ کہ جمود میں۔انہیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

ان کی زندگی میں دیکھتی ہے نہ کہ موت میں۔ جدلیات کے علم کا مطلب مستند حقائق اور اشیا کی ظاہری حالت کی غلامی سے آزادی ہے، جو کہ مصنوعی تجربیت پسندی کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔ سیاست کے میدان میں یہ خاصیت اصلاح پسندوں کی ہوتی ہے جو کہ اپنی قدامت پسندی، تنگ نظری اور بزدلی کو عملیت پسندی اور ''حقائق پرستی'' جیسی فلسفیانہ اصطلاحات میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جدلیات ہمیں موقع دیتی ہے کہ ہم دی گئی حالت، فوری اور بظاہر نظر آنے والی دنیا سے باہر مداخلت کرنے کی کوشش کریں اور اس پوشیدہ عمل کو دریافت کریں جو کہ سطح کے نیچے کارفرما ہوتا ہے۔ ہم نشاندہی کرتے ہیں کہ خاموش ظاہریت اور حرکت کی غیر موجودگی کے پیچھے سالماتی تبدیلیوں کا ایک عمل موجود ہوتا ہے۔ نہ صرف فزکس میں بلکہ سماج میں اور عوام کی نفسیات میں بھی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب لوگ یہ سمجھتے تھے کہ عروج اب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک مستقل مظہر بن چکا ہے۔ یہی ایک لاجواب حقیقت تھی یا بظاہر ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ لوگ جو اس ظاہری حقیقت بارے باتیں کرتے تھے انہیں سٹھیائے ہوئے احمق قرار دے دیا جاتا تھا۔ لیکن آج وہی لاجواب حقیقت ایک جھوٹ بن کے خاک میں مل چکی ہے۔ حقائق اپنے الٹ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہ جو ایک ناقابل تردید سچ لگتا تھا اب ایک جھوٹ میں بدل چکا ہے۔ ہیگل کے الفاظ میں کہا جائے تو ''دلیل بے دلیلی بن چکی ہے۔''

اس طریق کار کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ پہلے استعمال کرتے ہوئے اینگلز نے کئی شعبوں میں، اپنے بیشتر ہم عصر سائنسدانوں سے کہیں آگے دیکھنے کی کوشش کی اور آج کی جدید سائنس کے دریافت کردہ امور کی پیش بینی کی۔ اینگلز کسی طور پیشہ ور سائنسدان نہیں تھا لیکن وہ اپنے زمانے کی فطری سائنسوں کے حوالے سے وسیع علم رکھتا تھا۔ تاہم جدلیاتی تجزیے کے طریقے میں اپنی مہارت اور ادراک کی بدولت اینگلز نے آج کی سائنس کے حوالے سے کئی اہم فلسفیانہ تشریحات پیش کیں۔ اگرچہ آج بھی سائنسدانوں کی بڑی تعداد ان سے یکسر ناواقف ہے۔

بلاشبہ فلسفہ فطری سائنس کے قوانین پر حکم نہیں چلا سکتا۔ یہ قوانین، فطرت کے سنجیدہ اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

درست تجزیے کی بنیاد پر ہی نشوونما پاسکتے ہیں۔ سائنس کی ترقی تخمینوں، اندازوں کے ایک سلسلے سے اپنے خدوخال مرتب کرتی ہے۔ مشاہدے اور تجربے کے ذریعے ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ پوری سچائی کو جان سکیں۔ مادے اور کائنات کے پوشیدہ اسرار ورموز میں گہری مداخلت کا یہ ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ سائنسی نظریات کی سچائی کی پرکھ صرف عمل، مشاہدے اور تجربے سے ہوتی ہے، نہ کہ فلسفیوں کے کسی حکمنامے سے۔

ماضی میں فلسفیوں کی جانب سے جو بیشتر سوالات اٹھائے جاتے رہے، انہیں سائنس نے حل کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ سمجھ لینا بھی ایک بہت بڑی غلطی ہوگی کہ فلسفہ سائنس میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا۔ فلسفے کے دو پہلو ایسے ہیں جو آج تک مستند ہیں اور جنہیں آج تک کی سائنس ہضم یا ہڑپ نہیں کرسکی ہے۔ وہ ہیں رسمی منطق اور جدلیات۔ اینگلز کا اصرار تھا کہ سائنس کیلئے ''تصوف میں پھنسی جدلیات ایک مطلق ضرورت بن جاتی ہے۔'' بلاشبہ جدلیات کے پاس کوئی جادوئی صفت نہیں ہے کہ وہ جدید فزکس کو درپیش مسائل حل کرسکے۔ اس کے باوجود بھی ایک جامع اور مربوط فلسفہ، سائنسی تحقیق کی رہنمائی میں نتیجہ خیز معاونت کرسکتا اور اسے غیر منطقی اور تصوفانہ مفروضوں سے بچانے میں کردار ادا کرسکتا ہے۔ ان غیر منطقی مفروضوں سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ آج سائنس کو جن بے شمار مسائل کا سامنا ہے، اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ٹھوس فلسفیانہ بنیادوں سے محروم ہے۔

جدلیات اور سائنس

بہت سے سائنسدانوں کا فلسفے کے ساتھ رویہ توہین آمیز ہوتا ہے۔ جہاں تک 'جدید' بیہودہ فلسفے کا تعلق ہے، یہ توہین ٹھیک بھی ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں سے فلسفہ ایک ایسے لق ودق صحرا کی حالت میں ہے کہ جس میں زندگی کی رمق ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ ماضی کے بیش بہا خزانے اپنی قدیم عظمت اور روشن خیالی سمیت مکمل طور پر خواب وخیال ہو کے رہ گئے ہیں۔ نہ صرف سائنسدان بلکہ عام مردوزن بھی اگر اس خرابے میں قدم رکھیں تو انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کسی کو

(c) ketabton.com: The Digital Library

امید کی کوئی کرن بھی نہیں ملے گی۔ اس تلخ حقیقت کے باوجود بھی سائنسدانوں کے فلسفے بارے توہین آمیز رویوں کی کوئی مناسب وجہ موجود نہیں ہے۔اس کیلئے اگر ہم جدید سائنس کی موجودہ کیفیت پر سنجیدگی سے نظر دوڑائیں، یا زیادہ درست انداز میں یہ کہیں کہ اس کی نظریاتی الجھنوں اور مفروضوں پر غور کریں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حقیقت میں سائنس نے کبھی خود کو اس طرح فلسفے سے آزاد نہیں کیا تھا۔اسے ناخوشگوار انداز میں گھر سے باہر نکال دیا گیا ہے جس کے بعد سے فلسفہ عقبی دروازے (Back Door) سے سائنس میں داخل ہونے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ سائنسدان متکبرانہ انداز میں فلسفے سے اپنی مکمل بے نیازی کا دعویٰ کرتے ہوئے دراصل وہ سب مفروضے بیان کر رہے ہوتے ہیں جو اپنے کردار میں فلسفیانہ ہی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس قسم کی لاشعوری اور بلا تنقیدی فلسفہ بازی اپنی قدیم طرز سے کسی طور بلند نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں کم تر درجے کی حامل ہے۔اس سے بھی بڑھ کر یہ روش کئی عملی غلطیوں کا باعث بھی بنی ہوئی ہے۔

پچھلی صدی کی شاندار سائنسی ترقی نے فلسفے کو بے سود اور متروک کر کے رکھ دیا ہے۔ایک ایسی دنیا میں کہ جہاں ہم کائنات کے گہرے اسرار و رموز میں مداخلت کر سکتے ہیں اور زیریں جوہری ذروں (Sub-Atomic Particles) کی پیچیدہ حرکات کو سمجھ سکیں۔ وہ قدیم سوالات جنہوں نے فلسفیوں کے دماغوں کو الجھا رکھا تھا، سائنس نے حل کر دیے گئے ہیں۔ یوں اس انداز میں فلسفے کا رول کم کر دیا گیا ہے۔لیکن ہم یہاں دوبارہ اپنی بات کو دہرائیں گے کہ دو شعبے ایسے ہیں جہاں فلسفے کی اہمیت ابھی تک برقرار ہے: ایک رسمی منطق اور دوسرا جدلیات۔

سائنس کی تاریخ کے حوالے سے جدلیاتی طریق کار اپنانے کی ایک بڑی کاوش 1962ء میں ٹی ایس کوہن کی کتاب ''سائنسی انقلابات کا ڈھانچہ'' کی اشاعت تھی جس نے سائنسی انقلابات کی ناگزیریت کو عیاں کرتے ہوئے یہ دکھایا کہ کون سا ممکنہ میکنزم کہاں وقوع پذیر ہوا۔ ''ہر وہ چیز جو وجود رکھتی ہے، اسے غائب ہونا ہے'' یہ بات نہ صرف زندہ اجسام کیلئے درست ہے بلکہ سائنسی تھیوریوں کیلئے بھی، یہاں تک کہ ان تھیوریوں کے لئے بھی جنہیں آج ہم مطلق مستند

(c) ketabton.com: The Digital Library

سمجھے ہوئے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ اینگلز اپنے ہم عصروں سے (جن میں بہت سے سائنسدان بھی شامل ہیں) فطری سائنس بارے اپنے رویوں میں بہت آگے تھا۔ اس نے نہ صرف یہ وضاحت کی کہ حرکت (توانائی) مادے سے نا قابل تنسیخ ہوتی ہے بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ مختلف سائنسوں کے مابین اختلافات توانائی کی مختلف صورتوں کے اور توانائی کی ایک شکل کی دوسری شکل میں جدلیاتی تبدیلی کے مطالعے پر مشتمل ہوتے ہیں۔اسی کو آج کل مراحل کی تبدیلی (عبوری مراحل) کہا جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں سائنس کے تمام تر ارتقا نے پرانی شعبہ جاتی تقسیم کو مسترد کر دیا ہے۔ایک سائنس کے دوسری سائنس میں جدلیاتی تعامل کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مارکس اور اینگلز کو اپنے دور میں اپنے مخالفین کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے یہ کہا کہ نامیاتی (Organic) اور غیر نامیاتی (Inorganic) مادے کے مابین فرق اضافی ہوتا ہے۔انہوں نے واضح کیا کہ نامیاتی مادہ اور ابتدائی زندہ اجسام ایک وقت پر غیر نامیاتی مادے سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ ارتقا میں ایک معیاری جست تھی۔انہوں نے کہا کہ جاندار بشمول انسان، اس کا دماغ، اس کے تصورات اور اس کے عقائد، ایک مخصوص طرز میں مادے کی منظّم شکل اور اعلیٰ پیمانے کی مادی حرکت ہوتے ہیں۔نامیاتی اور غیر نامیاتی مادے کے مابین فرق، جسے کانٹ ایک نا قابل عبور رکاوٹ قرار دیتا تھا، اب ختم ہو چکی ہے۔جیسا کہ پروفیسر فین مین نے کہا ہے:

’’ہر چیز ایٹموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ ایک ابتدائی مفروضہ ہے۔مثال کے طور پر بائیولوجی کا سب سے اہم مفروضہ یہ ہے کہ ہر وہ کام جو جاندار کیا کرتے ہیں وہی ایٹم بھی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کوئی بھی ایسی زندہ چیز نہیں ہے جسے اس نکتہ نگاہ سے نہ سمجھا جا سکتا ہو کہ وہ ایٹموں سے بنی ہوئی اور فزکس کے قوانین کے مطابق سرگرم ہیں۔‘‘(پروفیسر رچرڈ فین مین؛ طبیعات پر لیکچرز)

سائنسی نکتہ نگاہ سے مرد وزن مخصوص طرز میں مرتب شدہ ایٹموں کا مجموعہ ہیں۔لیکن ہم صرف ایٹموں کا منظّم مجموعہ بھی نہیں ہیں۔انسانی جسم ایک غیر معمولی طور پر پیچیدہ وجود ہوتا ہے۔خاص

(c) ketabton.com: The Digital Library

طور پر انسانی دماغ، جس کے ڈھانچے، خواص اور سرگرمی کو ہم نے اب سمجھنا شروع کیا ہے۔ یہ مذاہب کی بیان کردہ سبھی پرانی کہانیوں سے کہیں زیادہ حیران کن اور خوبصورت ہے۔اسی دوران کہ جب مارکس سیاسی معاشیات میں انقلاب برپا کر رہا تھا، ڈارون انہی دنوں بائیولوجی کے شعبے میں انقلاب لا رہا تھا۔ یہ کوئی حادثہ نہیں کہ جب ڈارون کا کام سامنے آیا تو غم و غصے اور تضحیک کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا لیکن مارکس اور اینگلز نے فوری طور پر شاندار خراج پیش کرتے ہوئے اسے جدلیاتی شاہکار قرار دیا۔ اگرچہ ڈارون خود اس رمز سے ناآشنا تھا۔ اس بظاہر تضاد کی وضاحت یوں ہے کہ جدلیات ایک اتفاقی ایجاد نہیں بلکہ یہ فطرت اور سماج میں حقیقی طور پر موجود عمل کا اظہار ہیں۔ جینیات کی دریافتوں نے بالکل اسی عمل کا کھوج لگایا ہے جو ایک نوع کے دوسری نوع میں تبدیلی کا تعین کرتا ہے۔ انسانی جینوم نے ڈارون کے کام کو ایک نئی جہت فراہم کر دی ہے اور عیاں کیا ہے کہ انسان اپنے جینز نہ صرف تتلی بلکہ زندگی کی انتہائی اولین شکل، بیکٹیریا کے ساتھ بھی شیئر کرتے ہیں۔

آنے والے چند سالوں کے دوران سائنسدان لیبارٹری میں تخلیق کا عمل سرانجام دیں گے۔ جس میں ایک غیر نامیاتی مادے میں سے ایک نامیاتی جسم پیدا کیا جائے گا۔ الہامی خالق کے پاؤں تلے سے زمین کا یہ چھوٹا سا حصہ بھی چھن جائے گا اور جو آخر کار کسی کام کا نہیں رہے گا۔ ایک لمبے عرصے تک سائنسدان یہ دلیل دیتے رہے کہ یا تو نئی انواع کی تخلیق لمبے عرصے سے چلی آ رہی سست تبدیلیوں کا نتیجہ ہے یا پھر اچانک واقع ہونے والی کسی وحشی تبدیلی کا۔ جدلیاتی نکتہ نگاہ سے ان دونوں تصورات کے مابین کوئی تضاد نہیں ہے۔ مالیکیولر تبدیلیوں (مقداری تبدیلیوں) کا ایک طویل دورانیہ ایک مقام پر آ کر اچانک کچھ ایسا پیدا کر دیتا ہے جسے آج کل کوانٹم جست قرار دیا جاتا ہے۔

مارکس اور اینگلز کو یقین تھا کہ انواع کے ارتقا کی تھیوری اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ فطرت جدلیاتی انداز میں ہی کام کرتی ہوتی ہے، یعنی ترقی اور تضاد کے ذریعے۔ تین دہائی پہلے اس بات کو ایک انتہائی مقتدر ادارے برٹش میوزیم کی طرف سے بہت زیادہ پذیرائی میسر آئی جب

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہاں صدیوں پر محیط ایک قابل قدر خاموشی کو ایک تند و تیز بحث نے چیر کے رکھ دیا۔ ارتقائی کڑیوں میں معیاری جستوں کے تصور کا دفاع کرنے والوں کے خلاف ایک دلیل یہ تھی کہ یہ لوگ برٹش میوزیم کے معاملات میں کارل مارکس کو ملوث کر رہے ہیں۔ بہرحال اس کے باوجود جدید بائیولوجی کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنے پرانے تصور میں تبدیلی لائے کہ ارتقا ایک بتدریج، سیدھا، تبدیلیوں اور رکاوٹوں سے پاک ہوتا ہے اور یہ تسلیم کرے کہ معیاری جستیں ہوتی ہیں کہ جن کے دوران کئی انواع ختم ہو جاتیں اور کئی پیدا ہوتی ہیں۔ 17 اپریل 1982ء کو جریدے ''اکانومسٹ'' نے ڈارون کی صد سالہ یاد کے موقع پر ایک مضمون شائع کیا جس میں کہا گیا:

''روز بروز یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ چھوٹی، سادہ اور اچانک تبدیلیاں جو ترقی کے ایک اہم موڑ پر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کو متاثر کرتی ہیں، بڑی ارتقائی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں (مثال کے طور پر مخصوص جینز کے تعامل کی طرز میں چھوٹی سی تبدیلی دماغ کے سائز میں بڑے اضافے کا باعث بن سکتی ہے)۔ اس بات کے بھی شواہد اکٹھے کئے جا رہے ہیں کہ بہت سے جینز ایک سست لیکن ہموار تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑا تھوڑا کر کے سائنسدان اس چلے آ رہے قضیے کو حل کرتے جا رہے ہیں کہ کیا انواع طویل عرصے کی حامل آہستہ اور مسلسل تبدیلی سے گذرتی ہیں یا پھر ایک طویل عرصے تک ایک جیسی رہتی اور پھر اچانک ایک تیز ارتقائی تبدیلی کے تجربے سے گزرتی ہیں۔ امکان یہی ہے کہ دونوں قسم کی تبدیلیاں ہی وقوع پذیر ہوتی ہیں۔''

ارتقائی نظریے کا پرانا ماڈل یہ قرار دیتا آ رہا تھا کہ انواع صرف بتدریج تبدیل ہوتی ہیں، جونہی ایک انفرادی جینیاتی تبدیلی (Mutation) رونما ہوتی ہے، اسے فطرت منتخب کر لیتی ہے۔ تاہم بعد میں سٹیفن جے گولڈ اور نائلز ایلڈرج نے "Punctuated Equilibiruim" کے نام سے ایک نئی تھیوری پیش کی جس کے مطابق جینیاتی تبدیلیاں اچانک جستوں سے بھی واقع ہو سکتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سٹیفن جے گولڈ نے یہ تک کہہ دیا کہ اگر سائنسدانوں نے اینگلز کی تحریروں پر توجہ دی ہوتی تو وہ خود کو ایک ہزار سالوں کی غلطیوں سے محفوظ

(c) ketabton.com: The Digital Library

رکھ سکتے تھے۔

دیوالیہ ہوتی دنیا

2008ء میں شروع ہونے والے بحران کا پہلا مرحلہ بڑے بینکوں کے دیوالیہ ہو جانے پر مبنی تھا۔امریکہ سمیت دنیا بھر کے بینکاری نظام کو ریاستوں کی طرف سے کھربوں ڈالرز اور یوروز کے انجکشن لگا کر بچایا گیا۔لیکن یہ سوال لازمی پوچھا جانا چاہیئے کہ اس پرانے نظریے کا کیا بنا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر آزاد منڈی کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ سبھی مسئلے حل کر دے گی؟ اور اس عظیم نظریے کا کیا بنا کہ ریاست کو کسی طور معیشت کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عوامی سرمائے کے انجکشن بھی نتیجہ خیز نہیں رہے۔ بحران ٹالے نہیں ٹل رہا، ختم ہونا تو کجا اس نے اپنا رخ ریاستوں کی طرف کر لیا ہے۔ جو ہو چکا ہے وہ یہ کہ بینکوں کے ایک بہت بڑے خسارے کی جگہ اب پبلک مالیات کا ایک بہت بڑا بلیک ہول سامنے آ چکا ہے۔اس کی قیمت کون ادا کرے گا؟ اونچی ایڑیوں والے یہ بینکار؟ جنہوں نے اپنی کرتوتوں سے عالمی مالیاتی نظام کو ہی تہہ و بالا کر ڈالا اور جنہوں نے عوام کی خون پسینے کی کمائی کو چپکے سے اپنی جیبوں اور تجوریوں میں ڈال لیا ہے اور اب وہ خود کو بھاری بھاری بونسوں سے بھی نواز رہے ہیں۔نہیں قطعی طور پر نہیں۔ معاشی ماہرین اور سیاستدان جس خسارے کا اتنی تلخی و ترشی سے رونا رو رہے ہیں، اسے سماج کے سب سے کمزور اور غریب حصے پورا کریں گے۔اچانک یہ پتہ چلا ہے کہ بوڑھوں، بیماروں اور بیروزگاروں کیلئے کوئی رقم موجود نہیں البتہ بینکاروں کیلئے بے بہا پیسہ موجود ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ مستقل کٹوتیاں کرتی حکومتیں قائم ہو چکی ہے۔لیکن یہ صورتحال پھر نئے تضادات کو پیدا کر رہی ہے، طلب کو کاٹنے سے منڈی سکڑ جاتی ہے جس سے زائد پیداوار کا بحران مزید گہرا ہو جاتا ہے۔اب معاشی ماہرین ایک اور انہدام کی پیش گوئی کر رہے ہیں جس سے کرنسیاں اور حکومتیں گرتی چلی جائیں گی اور جس سے عالمی مالیاتی نظام کے تانے بانے بکھر جائیں گے۔اس سے قطع نظر کہ سیاستدان خساروں سے نمٹنے کے حوالے سے کیا کہتے ہیں، قرضوں کی شرح اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ انہیں ادا نہیں کیا جا سکتا۔یونان اس حقیقت کی ایک زندہ مثال بن چکا ہے۔ مستقبل ایک اور گہرے بحران، گرتے ہوئے معیارِ زندگی، دردناک سمجھوتوں اور انسانوں کی اکثریت

(c) ketabton.com: The Digital Library

منظرنامے سے لبریز ہے اور یہ سب کیلئے غربت میں دھکیلے جانے کے
کچھ بڑے اور اعلیٰ پیمانے پر نئی سرکشیوں، نئی طبقاتی جدوجہدوں کو جنم دینے کا ذریعہ بنے گا۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا عالمی بحران ہے۔

کچھ نفیس لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ اگر سوشلزم ناگزیر ہی ہے تو پھر اس کیلئے جدوجہد کیونکر کی جائے؟ ایک حقیقت کے طور پر یہ ممکن ہے کہ آپ ایک راسخ تقدیر پرست ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ایک سرگرم انقلابی کردار ادا کرنے کیلئے بھی خود کو وقف کرنے کو تیار ہوں۔ ساتویں صدی میں کالونسٹس (Calvinists) سخت تقدیر پرست ہوتے تھے۔ ان کا اس بات پر کامل ایمان تھا کہ تقدیر پہلے سے متعین ہوتی ہے اور یہ کہ ہر مرد و زن کی تقدیر اور نجات کا فیصلہ ان کے پیدا ہونے سے پہلے کیا جا چکا ہوتا ہے۔ تاہم اس قدر راسخ العقیدگی بھی کالونسٹوں کو کمزور پڑتے ہوئے جاگیردارانہ نظام اور اس کے نظریاتی محافظ رومن کیتھولک چرچ کے خلاف جدوجہد میں انقلابی کردار ادا کرنے سے نہیں روک سکی۔ اس کی مختصر وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انصاف کے قائل اور اپنے مقصد کی کامیابی کی ناگزیر فتح پر کامل یقین رکھتے تھے اور یہ اپنی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے مکمل بہادری سے لڑے تھے۔

اس وقت پرانا سماج اپنے قدموں پر کھڑا کھڑا مر رہا ہے اور ایک نیا سماج جنم لینے کی تگ و دو کر رہا ہے لیکن وہ صاحبان جو کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ امیر بنا چکے ہیں وہ ایسے سماج کے خاتمے کی ناگزیریت کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ سب کچھ ڈوبتا دیکھ کر ،حکمران طبقہ ترجیح دے گا کہ وہ سارے سماج کو ہی لے ڈوبے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی موت کے عمل کے طول پکڑنے نے انسانی تہذیب و ثقافت کیلئے سنگین اور مہلک خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ ہمارا یہ اولین فریضہ بنتا ہے کہ ہم نئے سماج کے جنم کے عمل میں معاونت کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ یہ عمل نفاست سے سرانجام پائے اور کم سے کم تکلیف دہ ہو اور جس کے دوران انسانیت کا کم سے کم نقصان ہو۔ اپنے دشمنوں کے واویلے کے برعکس، مارکسسٹ کسی طور تشدد کی وکالت نہیں کرتے لیکن ہم حقیقت پسند ہیں اور ہم یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ پچھلے دس ہزار سالوں کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ کسی بھی حکمران

(c) ketabton.com: The Digital Library

طبقے یا پرت نے اپنی دولت، طاقت اور مراعات سے بغیر لڑائی کیے دستبردار ہونا قبول نہیں کیا۔اس کا عام مطلب یہی ہے کہ یہ لڑائی ابھی متروک نہیں ہوئی اور آج یہی معاملہ پھر سے درپیش ہے۔

یہ سرمایہ دارانہ نظام کی زوال پذیری ہی ہے کہ جس نے دنیا کو وحشیانہ ترین تشدد کی طرف دھکیل دیا ہے۔تشدد کے امکانات کو کم سے کم کرنے، انتشار اور جنگوں کو ختم کرنے، سوشلزم کی طرف انتہائی پرسکون اور منظّم عبور کیلئے سب سے پہلی ترجیح اور شرط یہ ہے کہ محنت کش طبقہ جدوجہد کیلئے متحرک ہو اور حتمی کامیابی تک لڑائی کی تیاری کرے۔

''تمام راستے تباہی کی جانب''

سرمایہ دارانہ نظام کی جانب سے ہر ایک کو محفوظ اور خوشحال مستقبل فراہم کرنے کے، اب تک پیش کیے جانے والے دلکش دعوؤں کے بالکل برعکس جو حقیقی دنیا ہم دیکھ رہے ہیں اس میں کروڑوں انسان غربت اور بھوک کا شکار ہیں جبکہ امیر لوگ امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ ایک مستقل خوف کی حالت میں جی رہے ہیں کہ ان کا مستقبل کیسا ہوگا جس کا فیصلہ لوگوں کے معقول فیصلوں نے نہیں بلکہ منڈی کے وحشی اتار چڑھاؤ نے کرنا ہے۔ مالیاتی بحرانوں، وسیع بیروزگاری اور پے درپے سیاسی وسماجی سرکشیوں نے بہت سی چیزوں کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ جو مستحکم اور مستقل چلا آ رہا ہوتا ہے، وہ راتوں رات تحلیل ہو جاتا ہے۔ یوں لوگ جن چیزوں کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں ان کے بارے سوالیہ انداز میں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسلسل بے چینی کی یہ کیفیت نفسیاتی طور پر انقلاب کیلئے زمین کو ہموار کرتی ہے جو آخر کار واحد قابلِ تصور حقیقی حل بن کر سامنے آتا ہے۔ اس بات کو عمل میں دیکھنے کیلئے کوئی ایک نظر یونان پر ڈالے تو اسے سمجھ آ جائے گی۔

ہر کوئی یہ بات جان چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام بحران میں ہے۔ لیکن اس بحران کا علاج کیا ہے؟ اگر سرمایہ دارانہ نظام انتشار اور اتھل پتھل کا حامل نظام ہے جو ناگزیر طور پر بحران پیدا کرتا رہتا ہے تو لامحالہ کوئی بھی یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ بحرانوں سے نجات کیلئے سرمایہ دارانہ نظام کو ہی ختم کرنا پڑے گا۔ اگر آپ ''الف'' کہہ سکتے ہیں تو پھر آپ کو ''ب، پ'' کہنا بھی آنا

(c) ketabton.com: The Digital Library

چاہئے۔لیکن بورژوا معاشی ماہرین یہ کچھ کرنے سے انکاری ہیں۔ کیا ایسے میکنزم موجود نہیں ہیں کہ جن کی مدد سے بورژوازی زائد پیداوار کے بحران سے باہر نکل سکے؟ بلاشبہ یہ موجود ہیں۔ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ شرحِ سود کو کم کیا جائے تا کہ منافعوں کی شرح کو بڑھایا جاسکے اور سرمایہ کاری کو فروغ دیا جا سکے۔لیکن سود کی شرح تو پہلے ہی صفر کے قریب ہے۔چلیں اسے کچھ اور کم کرتے ہیں یعنی اسے منفی سطح پر لے جاتے ہیں،اس سے بینک لوگوں کو قرض پر پیسے دیں گے۔ یہ سراسر پاگل پن ہے لیکن یہ سرمایہ دار ایسا کرنے بارے بحث مباحثہ کر رہے ہیں! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کس قدر بے چین ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ریاستی اخراجات بڑھائے جائیں اور یہی وہ طریقہ ہے جس کی اصلاح پسند اور کینیشینسٹ ماہرین وکالت کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آزاد منڈی کی معیشت کے دیوالیہ پن کو عیاں کرتی ہے۔نجی شعبہ اتنا کمزور، خستہ حال اور درست الفاظ میں بیان کیا جائے تو اتنا دیوالیہ ہو چکا ہے کہ اسے لازماً ریاست پر انحصار کرنا پڑ گیا ہے جیسے ٹانگوں سے محروم کسی فرد کو بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔لیکن یہ حل بھی بچنے کا راستہ نہیں دے رہا۔

یہ عیاں ہے کہ بینک اور بڑی اجارہ داریاں اپنی بقا کیلئے ریاست کی محتاج ہو چکی ہیں۔ مشکلات میں گھر جانے کے فوری بعد، یہ سب لوگ جو یہ کہتے آ رہے تھے کہ ریاست کو کسی طور بھی معیشت میں کوئی کردار ادا نہیں کرنا چاہئے ،فوراً ہی ہاتھ پھیلائے حکومت کے پاس پہنچ گئے اور بھاری بھرکم رقوم فراہم کیے جانے کا مطالبہ کرنے لگے۔حکومت نے بھی انہیں فوری طور پر بلینک چیک دے دئے۔عوامی سرمائے میں سے کھربوں پاؤنڈز بینکوں کے حوالے کر دیے گئے ،مجموعی طور پر یہ رقم 14 کھرب ڈالرز کے لگ بھگ بنتی ہے۔لیکن بحران جاری وساری ہی نہیں بلکہ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔پچھلے چار سالوں کے دوران جو حاصل ہوا ہے وہ اس قدر ہے کہ تباہی کا جو اژدہا بینکوں کو نگلنے جا رہا تھا اب اس کا منہ پبلک مالیات کی جانب کر دیا گیا ہے۔بینکوں کو بچانے کیلئے ہر عام فرد سے توقع کی جا رہی ہے کہ وہ قربانی دے لیکن بینکاروں اور سرمایہ داروں سے کسی قربانی کا نہیں کہا جا رہا۔الٹا یہ لوگ ٹیکس ادا کرنے والوں کے پیسوں سے خود کو بھاری بھرکم بونس دیتے چلے آ رہے ہیں۔ بھاری خساروں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ریاستی اخراجات میں

(c) ketabton.com: The Digital Library

اضافہ کرنے کی کینیشینسٹ دلیل اپنے ہی بوجھ تلے دب چکی ہے۔ ریاست بھلا کس طرح سے وہ رقم خرچ کرے جو اس کے قبضۂ قدرت میں ہی نہیں ہے؟ ایک راستہ ان کے لئے ابھی تک کھلا ہے اور وہ ہے کرنسی کی اشاعت، جسے انتہائی بھونڈے پن سے "Quantitative Easing" یعنی ''مقداری آسانی'' کا نام دیا گیا ہے۔ بہت بھاری مقدار میں مصنوعی سرمائے کے انجکشن سے معیشت کو چلانا اپنی تباہی کیلئے خود گڑھا کھودنے کے مترادف ہے۔ یہ اس نشئی کی سی کیفیت ہے جو خود کو زیادہ سے زیادہ مقدار کی منشیات کا ٹیکہ لگاتا ہے تاکہ پہلے جیسے اثرات لے سکے۔ یوں یہ نظام کو مزید زہریلا کرتے ہوئے اس کی صحت کو مزید تباہ کرتے جا رہے ہیں۔ یہ اقدام ایک حقیقی بوکھلاہٹ کا اظہار ہے جو جلد یا بدیر افراطِ زر میں اضافہ کرے گا۔ اس طریقے سے یہ آنے والے وقتوں میں ایک اور زیادہ گہرے بحران کا رستہ ہموار کر رہے ہیں۔ یہ اس حقیقت کا ناگزیر نتیجہ ہے کہ پچھلے عرصے میں سرمایہ دارانہ نظام اپنی حدود سے باہر نکل چکا ہے۔ ایک بحران سے بچنے اور اسے روکنے کیلئے انہوں نے وہ طریقے پہلے ہی اختیار کر لئے جواب جا کر ان کو بچا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بحران اتنا گہرا اور سخت ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جیسا کہ مارکس نے وضاحت کی تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے بحرانوں سے اسی صورت میں نکلتا ہے کہ جب یہ ''اپنے لئے مزید شدید اور زیادہ تباہ کن بحران پیدا کرے اور ان سبھی ذرائع کو تہس نہس کر دے جو کہ بحرانوں کو ٹال سکتے ہیں۔'' (کمیونسٹ مینی فیسٹو)

بہت قدیم دنوں میں چرچ کہا کرتا تھا ''سبھی راستے روم کی طرف''، آج کل بورژوازی نے نیا نعرہ لگا رکھا ہے ''سبھی راستے بربادی کی طرف۔'' یہ بات ہی ناقابلِ تصور لگتی ہے کہ ایک بحران جو ساری دنیا کو انتشار میں دھکیلتا جا رہا ہے، جو لاکھوں انسانوں کو بیروزگاری، غربت اور مایوسی کی دلدل میں دھنساتا جا رہا ہے، جو نوجوان نسل سے ان کا مستقبل چھیننے پر اترا ہوا ہے، جو صحت، گھر، تعلیم اور ثقافت کو تباہ کر رہا ہے، ایسے میں یہ سب ایک سیاسی وسماجی بحران پیدا کئے بغیر ہوتا رہے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا بحران ہر طرف انقلاب کیلئے حالات تیار کر رہا ہے۔

یہ کسی طور کوئی نظریاتی مفروضہ نہیں رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اگر ہم پچھلے بارہ مہینوں پر ہی نظر دوڑائیں تو ہم کیا دیکھتے ہیں؟ ایک کے بعد دوسرے ملک میں انقلابی تحریکیں وقوع پذیر ہوئی

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہیں۔ تیونس، مصر، یونان ،سپین حتیٰ کہ امریکہ کے اندر آکوپائی وال سٹریٹ موومنٹ اوراس سے کچھ پہلے وسکانسن میں بڑے عوامی احتجاج۔ یہ ڈرامائی واقعات ایک واضح علامت ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کا بحران عالمی سطح پر ایک مزاحمت پیدا کررہا ہے۔ لوگ صورتحال سے انقلابی اسباق اخذ کرتے جارہے ہیں۔

جب تک زمین، بینک اور بڑی اجارہ داریاں ایک محدود اقلیت کے ہاتھوں میں رہیں گی، تب تک سبھی بنیادی فیصلے بھی یہی اقلیت کرے گی، ایسے فیصلے جنہوں نے کرۂ ارض کے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں اور قسمتوں کو متاثر کرنا ہے۔ امیروں اور غریبوں میں بڑھ جانے والا ناقابلِ برداشت فرق، سماجی بندھنوں پر اپنا دباؤ بڑھائے چلا جارہا ہے۔ پرانی سوشل ڈیموکریسی کے طبقاتی امن اور سماجی دوستی پرمبنی سماج کے خواب کی بنیادیں کچھ اس طرح ٹوٹ چکی ہیں کہ دوبارہ تعمیر نہیں ہوسکتیں۔ آکوپائی وال سٹریٹ موومنٹ کے ایک نعرے میں اس حقیقت کو اس طرح کوزے میں بند کرکے پیش کیا گیا ''ایک چیز جو ہم میں عام ہے وہ یہ ہے کہ ہم 99 فیصد ہیں جو کسی طور ایک فیصد کی لالچ اور بدعنوانی کو مزید برداشت نہیں کریں گے۔''

مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ احتجاجی تحریک اپنے مقاصد میں ابہام کا شکار ہے۔ یہ ایک مربوط پروگرام اور جرأتمند قیادت سے محروم ہے۔ لیکن یہ غم وغصے کا عمومی اظہار ضرور کررہی ہے جو کہ سطح کے نیچے پھل پھول رہا ہے اور جو جلد ہی اپنا رستہ ڈھونڈ نکالے گا۔ لیکن ایک بات جو طے ہے کہ یہ سبھی تحریکیں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہیں اور جلد یا بدیر، ایک یا دوسرے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے کے انقلابی اقدام کا سوال سامنے آجائے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ہوتے ہوئے، جیسا کہ مارکس نے واضح کیا تھا، پیداواری قوتوں نے انتہائی حیران کن ترقی کی ہے۔ اس کے باوجود بھی حکمران طبقات کے نظریات، اپنے سب سے انقلاب آفرین عہد میں بھی، پیداوار، تکنیک اور سائنس سے بہت پیچھے رہ گئے۔

ثقافت کو درپیش خطرہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

سائنس و تکنیک اور انسانیت کی ترقی کے مابین فرق کا سب سے واضح اظہار دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک امریکہ میں ہوتا ہے۔ یہ وہ ملک ہے کہ جہاں سائنس نے سب سے حیران کن نتائج حاصل کیئے ہیں۔ انسان کی حتمی نجات کی بنیادی شرط ٹیکنالوجی کی مسلسل ترقی ہے۔ انسان کی معیشت کی شعوری منصوبہ بندی کی بدولت غربت ،ناخواندگی، جہالت، بیماری اور فطرت کے انسان پر غلبے کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ نہ صرف کرۂ ارض بلکہ خلا کی تسخیر کا راستہ کھل چکا ہے۔ اس سب کے باوجود تکنیکی طور پر سب سے ترقی یافتہ ملک کے اندر قدیم ترین توہمات اپنی حکمرانی قائم کیئے چلے آرہی ہیں۔ دس میں سے نو امریکی ایک الہامی وجود پر یقین رکھتے ہیں، جبکہ دس میں سے سات موت کے بعد زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ 1968ء کے کرسمس کے دن، جب چاند کے گرد چکر لگانے والے پہلے انسان سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے امریکی عوام کیلیئے خلا سے کیا پیغام دینا چاہتا ہے تو اس نے دنیا بھر کے ادب میں سے "Genesis" کی پہلی کتاب کا انتخاب کیا۔ جدید ترین آلات اور مشینری سے لیس اپنے خلائی جہاز میں بیٹھ کر اس نے یہ الفاظ کہے "ابتدا میں خدا نے زمین اور جنت کو تخلیق کیا۔"

ڈارون کی وفات کو ایک سو تیس سال سے زیادہ بیت چکے ہیں۔ امریکہ میں اب بھی لوگوں کی بڑی تعداد کو یقین ہے کہ بائبل میں جو کہا گیا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔ یہ لوگ سکولوں میں کتابِ مقدس میں موجود انسانی تخلیق کے پڑھائے جانے کو فطری انتخاب پر مبنی ارتقائی نظریے کے پڑھائے جانے پر ترجیح دیتے ہیں۔ تخلیقی نظریے کو زیادہ معتبر بنانے کیلیئے اس کے بہی خواہوں نے اسے "Intelligent Design" کا نیا نام دیا ہے جس سے فوری طور پر ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس ذہین ڈیزائنر کو کس نے ڈیزائن کیا؟ اس معقول سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ نہ ہی کوئی اس بات کی وضاحت کرسکتا ہے کہ ان کے مبینہ ذہین ڈیزائنر نے دنیا بنانے کا اتنا مایوس کن اور تباہ کن کام کیونکر کیا؟ کیوں ایسی دنیا ڈیزائن کی جس میں کینسر، طاعون، ایڈز اور مائیگرین جیسی موذی بیماریاں ہیں۔ خون پی کر زندہ رہنے والے چوہے، کیڑے، سرمایہ دار اور بینکار کیوں ڈیزائن کیئے گئے؟ اس بات کو بھی سوچا جانا چاہئے کہ کیونکر ہمارے جینز کی بہت

(c) ketabton.com: The Digital Library

بڑی تعداد بیکار مادے سے بنی ہوتی ہے؟ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہی تاثر ملتا ہے کہ ہمارے ذہین ڈیزائنر اتنے بھی ذہین نہیں ہیں۔کیسٹائل کے بادشاہ عظیم الفانسو (84-1221ء) نے کہا تھا کہ ''اگر میں دنیا تخلیق کرتے وقت موجود ہوتا تو بہت ہی سود مند مشورے دیتا تا کہ ایک بہتر کائنات تشکیل دی جاسکتی۔'' بے شک ایک گیارہ سالہ اوسط درجے کا ذہین بچہ بھی اس سے بہتر کام کرلیتا۔ یہ درست ہے کہ مغربی ملکوں کے اندر چرچ کی اتھارٹی انحطاط کا شکار ہے۔عملی ایمان رکھنے والوں کی تعداد بہت کم بچی ہے۔سپین اور آئر لینڈ جیسے ملکوں میں تو چرچ کو نئے پادری بھرتی کرنے میں مشکلات کا سامنا پڑ رہا ہے۔حالیہ عرصے میں عوام خاص طور پر نوجوانوں کی چرچ میں حاضری بہت تیزی سے کم ہوئی ہے۔تاہم چرچ کے اس انحطاط کے بعد سے مختلف قسموں اور طرزوں کے فرقے ،مصری طاعون کی وبا کی طرح پھیلے ہیں جو ہر قسم کے تصوف اور توہمات سے اٹے ہوئے ہیں۔قرونِ وسطیٰ کے بربریت کے عہد کی باقیات میں سے ایک، دست شناسی ایک فیشن کی طرح عام ہو چکی ہے۔سینما،ٹیلیویژن اور کتب خانے اس قسم کے مواد سے لبریز ہیں جو بہت عریاں تصوف اور توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سماجی نظام کے گلنے سڑنے کی واضح نشانیاں ہیں جو اپنی عمر پوری کر چکا ہے اور جو کسی طور ایک تاریخی ترقی پسند قوت نہیں رہا اور جو آخر کار پیداواری قوتوں کے خلاف کھلے تصادم پر اتر آیا ہے۔اس تناظر میں محنت کش طبقے کی طرف سے بورژوا سماج کے درد زدہ حصے کو ایک سرجن کی طرح کاٹ پھینکنے کی جدوجہد کا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ سائنس اور کلچر کی ان حاصلات کے دفاع کی بھی جدوجہد ہے جنہیں بربریت کی قوتیں ہڑپ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

انسانیت کے سامنے واضح متبادل موجود ہیں۔۔۔سماج کی سوشلسٹ تبدیلی، بورژوازی کی سیاسی اور معاشی قوتوں کا خاتمہ،انسانی تہذیب کی ترقی کیلئے ایک نئے مرحلے کی جستجو اور تگ ودو۔۔۔یا پھر تہذیب، یہاں تک کہ خود زندگی کا خاتمہ اور تباہی۔ارضیات کے ماہرین مسلسل یہ انتباہ کرتے آرہے ہیں کہ ماحول کو برباد کیا جارہا ہے اور اس سے انسانیت کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ یہ لوگ بالکل درست کہتے ہیں لیکن یہ اس ناتجربہ کار ڈاکٹر سے مشابہت رکھتے ہیں جو بیماری کی

(c) ketabton.com: The Digital Library

علامات کی تو نشاندہی کرتا ہے لیکن بیماری کی نوعیت کی تشخیص نہیں کرسکتا یا اس کا علاج نہیں تجویز کرسکتا۔ نظام کی تنزلی کی علامات ہر سطح پر واضح ہیں، نہ صرف معاشیات کے شعبے میں بلکہ اخلاقیات، ثقافت، فن، موسیقی اور فلسفے میں بھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کو طول دینے کی کوشش میں صرف پیداواری قوتوں کو ہی تباہ نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس سے کلچر کو بھی شدید خطرات لاحق ہیں، اس سے شکستگی کے جذبات تقویت پارہے ہیں اور سماج کی سبھی پرتیں چڑچڑے پن کی زد میں آئی ہوئی ہیں۔ ان سب کے مستقبل میں بہت بھیانک اثرات سامنے آئیں گے۔ آگے چل کر سرمایہ دارانہ نظام کا وجود جمہوریت اور محنت کش طبقے کے ٹریڈ یونین حقوق کے ساتھ بھی دشمنی پر اتر آئے گا۔ جرائم اور تشدد میں اضافہ، جنسی بے راہروی، بورژوا خودغرضی، دوسروں کی تکالیف سے بے رحمانہ بے نیازی، اذیت پسندی، خاندان کی ٹوٹ پھوٹ اور روایتی اخلاقیات کا انہدام، منشیات اور شراب نوشی میں اضافہ۔۔۔ یہ سب چیزیں مل کر رجعتیت پرستوں کے منافقانہ غم و غصے کو مشتعل کرتی جارہی ہیں اور یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی کامل زوال پذیری کی علامات ہیں۔ سلطنتِ روم میں غلام دارانہ سماج کے انحطاط کے وقت بھی بالکل ایسا ہی مظہر سامنے آیا تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام جو منافع کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتا ہے، اب اس فضا کو جس میں ہم سب سانس لیتے ہیں، اس خوراک کو جسے ہم کھاتے، اس پانی کو جسے ہم پیتے ہیں زہریلا کرتا جارہا ہے۔ یورپ میں گوشت کی پیداوار میں ملاوٹ کا حالیہ نیا سکینڈل اسی کی غمازی کرتا ہے اور یہ تو ابھی برفشار کا پہلا قطرہ ٹپک کے سامنے آیا ہے۔ اگر ہم بڑی اجارہ داریوں یا بینکوں کو مزید پچاس سال یا زیادہ عرصہ کام کرتے رہنے دیں گے تو عین ممکن ہے کہ کرۂ ارض کی تباہی اس نقطے تک پہنچ جائے کہ جسے پھر سنبھالنا ہی ناممکن ہوجائے اور یوں انسانیت کے وجود کا مستقبل ہی داؤ پر لگ جائے۔ چنانچہ سماج کو تبدیل کرنے کی جدوجہد اب زندگی اور موت کی جدوجہد بن چکی ہے۔

منصوبہ بند معیشت کی ضرورت

گزشتہ بیس سالوں کے دوران یہ معاشی پروپیگنڈہ سن سن کر ہمارے کان پک گئے تھے کہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایک سوشلسٹ منصوبہ بند معیشت کا نظریہ مر چکا ہے اور یہ کہ منڈی کی معیشت اپنے ہی سبھی اوزاروں اور طریقوں سے بیروزگاری کو یکسر ختم کرتے ہوئے دنیا کو امن اور خوشحالی سے ہمکنار کردے گی۔اب 2008ء کے مالیاتی انہدام کے بعد سے لوگوں کے سامنے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح کھل کر سامنے آچکی ہے کہ موجود نظام سب سے بنیادی انسانی ضروریات تک فراہم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔یعنی ایک روزگار، زندہ رہنے کیلئے درکار اجرت، ایک گھر، اچھی تعلیم، علاج معالجہ، ایک مناسب پنشن، ایک محفوظ ماحول، آبادی کی بہت بڑی اکثریت کیلئے صاف ہوا اور صاف پانی۔ ایسے نظام کی ملامت کرنا ان تمام غوروفکر کرنے والے انسانوں کا فرض بنتا ہے جن کی آنکھیں بیہودہ دلائل کی ان چکا چوند بجلیوں سے اندھی نہیں ہوئیں، جو تواتر کے ساتھ پیش کئے جاتے آرہے ہیں اور جن کا حتمی مقصد ان لوگوں کے مخصوص مفادات کا تحفظ کرنا ہے جو اس نظام کے ڈھانچوں سے کلیتاً مستفید ہوتے چلے آرہے ہیں اور جو کبھی بھی یہ یقین نہیں کر سکتے اور نہ ہی کریں گے کہ سب اسی طرح نہیں چلے گا اور اسے ایک دن ختم ہونا ہے۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو اور اس کتاب کا مرکزی نکتہ یہ انقلابی پیغام ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ہمیشہ کیلئے نہیں ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جسے موجودہ نظام کے عذرخواہوں کیلئے نگلنا مشکل ہورہا ہے اور یہ بات فطری بھی ہے۔ تاریخ کے ہر سماجی معاشی نظام کو یہی خوش فہمی لاحق رہی ہے کہ سماجی ترقی صرف اسی کے ہی دم قدم سے وابستہ ہے اور رہے گی۔ حالانکہ عام انسانی فہم کے نکتہ نگاہ سے بھی یہ سوچ صریحاً غلط ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فطرت میں ہر شے تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے تو پھر سماج اس سے کیسے مبرا ہوسکتا ہے؟ جو حقائق ہم نے سامنے رکھے ہیں وہ اشارہ کررہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے ترقی پسندانہ مشن سے دستبردار ہو چکا ہے۔ ہر ذہین انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ پیداواری قوتوں کی آزادانہ ترقی تقاضا کرتی ہے کہ دنیا کے سبھی ملکوں کی معیشت کو ایک مشترکہ منصوبے میں باہم جوڑ دیا جائے ۔جس کی بدولت ہم کرۂ ارض کے بے شمار اور بیش بہا وسائل کو دنیا بھر کے انسانوں کیلئے بروئے کار لانے کے قابل ہوسکیں گے۔ اس سچائی کو وہ سبھی

(c) ketabton.com: The Digital Library

سائنسدان اور ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں جن کا سوشلزم سے کوئی تعلق واسطہ نہیں لیکن جن کے دل و دماغ اس کرب سے بھرے ہوئے ہیں کہ نسلِ انسانی کا دو تہائی حصہ انتہائی ہولناک حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں اور اس بارے سخت تشویش کا شکار ہیں کہ ماحولیات کی تباہی کیا کیا گُل کھلا رہی ہے۔ بدقسمتی سے ان کی نیک نیتی پر مبنی باتیں اور مطالبات سماعت سے محروم لوگوں پر کوئی اثرات مرتب نہیں کر رہے کیونکہ ان کی وجہ سے بڑی اجارہ داریوں کے مفادات پر حرف آتا ہے جن کا عالمی معیشت پر قبضہ اور غلبہ ہے اور جن کے حساب کتاب میں انسانیت کی فلاح و بہبود اور کرۂ ارض کے مستقبل نام کی کوئی شے وجود ہی نہیں رکھتی۔ کبھی نہ ختم ہونے والے لالچ اور منافعوں کیلئے بھاگ دوڑ ہی ان کیلئے زندگی کی سب سے پہلی اور حتمی ترجیح ہے۔

معاشی منصوبہ بندی کی سرمایہ دارانہ انتشار پر برتری کو تو خود بورژوازی بھی سمجھتی ہے، اگرچہ اس کا وہ کھلے بندوں اعتراف نہیں کر سکتی۔ جب ہٹلر کی فوج نے 1940ء میں فرانس کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا اور برطانیہ کو اپنی پشت دیوار سے لگانے پر مجبور کر دیا تھا، تب انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا تھا؟ کیا یہ کہا تھا کہ منڈی کی قوتوں کو فیصلہ کرنے دیا جائے؟ ہرگز نہیں، بلکہ انہوں نے معیشت کو مرکوز کر لیا تھا، ضروری صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تھا اور فوری طور پر مؤثر حکومتی کنٹرول لاگو کر دیے گئے تھے، کئی معاشی قواعد و ضوابط متعارف کرائے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں مرکزیت اور منصوبہ بندی پر مائل ہوئے؟ اس کی صاف سیدھی وجہ ہے کہ معاشی منصوبہ بندی بہت بہتر نتائج دیتی ہے۔ اس میں کوئی بحث نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پیداوار کی کوئی حقیقی منصوبہ بندی ناممکن ہوتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود جنگ کے دنوں میں چرچل کی مخلوط حکومت کی طرف سے ریاستی سرمایہ دارانہ منصوبہ بندی، ہٹلر کو شکست دینے کیلئے بہت ضروری تھی۔ اس کی ایک اور حیران کن مثال سوویت یونین بھی تھا۔ یورپ میں دوسری عالمی جنگ دراصل ہٹلر کے جرمنی کی، جسے سارے یورپی وسائل کی پشت پناہی بھی میسر تھی، سوویت یونین کے ساتھ بہت بڑے تنازعے کا شاخسانہ تھی۔ یہ سوویت یونین تھا جس نے ہٹلر کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس غیر معمولی فتح کو

(c) ketabton.com: The Digital Library

سرمایہ دارانہ نظام کا دفاع کرنے والے کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنا ثبوت بھی آپ پیش کرتی ہے۔قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت ہی سوویت یونین کو جنگ میں واضح برتری دلانے کا سبب بنی تھی۔سٹالن کی مجرمانہ پالیسیوں اور بیوقوفیوں کے باعث سوویت یونین جنگ میں انہدام کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن منصوبہ بند معیشت کے باعث سوویت یونین کو بحالی کا موقع مل گیا اور اس نے اپنی صنعتی اور عسکری صلاحیت کو دوبارہ استوار کرلیا۔روسیوں نے مغرب میں واقع اپنی سبھی صنعتوں کو اکھاڑ دیا۔1500 کارخانوں اور ڈیڑھ کروڑ ورکروں کو ریل اور بحری جہازوں کے ذریعے یورال کے مشرقی علاقے میں منتقل کردیا جہاں وہ جرمنوں کی دسترس سے باہر تھے۔کچھ ہی مہینوں کے اندر سوویت یونین، جرمنی کو ٹینکوں، بندوقوں اور جہازوں کی پیداوار میں پیچھے چھوڑ گیا۔اس سے بلاشک وشبہ قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت کی دیوہیکل برتری ثابت ہوجاتی ہے۔ہر چند کہ یہ سٹالنسٹ افسرشاہی کے زیر انتظام ہی تھی۔دوسری عالمی جنگ میں سوویت یونین کے 2 کروڑ 70 لاکھ افراد جاں بحق ہوئے تھے جو مجموعی اموات کا نصف تھے۔اس کی صنعت اور زراعت بھی شدید ہولناک تباہی سے دوچار ہوئی۔اس کے باوجود دس سالوں میں ہی ہر چیز دوبارہ سے تعمیر کرلی گئی تھی اور اس کیلئے باہر سے کوئی سرمایہ بھی فراہم نہیں کیا گیا تھا جیسا مغربی یورپ کو امریکہ نے مارشل پلان کے تحت فراہم کیا۔عالمی جنگ کے بعد کا حقیقی معاشی معجزہ جاپان اور جرمنی نے نہیں، سوویت یونین نے کردکھایا تھا۔

بلاشبہ سوشلزم کو جمہوریت کی بنیاد پر استوار ہونا چاہئے لیکن یہ وہ مصنوعی جمہوریت نہیں جو امریکہ اور برطانیہ میں رائج ہے، کہ جس میں کوئی بھی بول تو سکتا ہے لیکن جہاں سبھی فیصلے بڑے بینک اور اجارہ داریاں ہی کرتی ہیں۔اس کے برعکس ایک ایسی حقیقی اور خالص جمہوریت کہ جس کا کنٹرول اور انتظام سماج کے پاس ہو اور جس میں کام کرنے والے خود شریک ہوں۔اس آئیڈیے میں کچھ بھی یوٹوپیائی نہیں ہے۔اس کی بنیاد پہلے ہی موجود ہے۔یہاں ایک مثال آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔راقم الحروف کیلئے یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی حیرانی ہے کہ ٹیسکو (Tesco) جیسی

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایک بڑی سپر مارکیٹ کس طرح سے   اتنی بڑی مقدار میں چینی، بریڈ اور دودھ اکٹھا کرتی ہے جو کہ لندن شہر کے ایک ایسے علاقے کیلئے کافی ہو جاتا ہے جس میں لاکھوں افراد رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سائنٹفک منصوبہ بندی سے ممکن بنایا جاتا ہے اور اس میں کوئی تعطل بھی نہیں آتا۔ اگر ایک سپر مارکیٹ کیلئے اس سطح تک کی منصوبہ بندی کارگر ہو سکتی ہے تو منصوبہ بندی کا طریق کار سارے سماج کیلئے کیوں قابلِ عمل نہیں ہو سکتا؟

سوشلزم اور بین الاقوامیت

جس نے بھی کمیونسٹ مینی فیسٹو کا مطالعہ کیا ہے اسے علم ہے کہ مارکس اور اینگلز نے اس صورتحال کی 150 سو سال پہلے پیش گوئی کر دی تھی۔ انہوں نے واضح کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام لازماً ایک عالمی نظام کے طور پر ترقی کرے گا۔ آج یہ تجزیہ واقعات اور حالات نے بالکل درست ثابت کر دیا ہے۔ آج کی موجودہ کیفیت میں کوئی شخص بھی عالمی منڈی کے بے رحمانہ غلبے سے انکار نہیں کر سکتا۔ جب یہ لکھا جا رہا تھا تب عملاً کوئی ایسے اعداد و شمار بھی دستیاب نہیں تھے جو اس مفروضے کی معاونت کرتے۔ تب صرف برطانیہ ہی واحد حقیقی ترقی یافتہ سرمایہ دار معیشت تھی۔ فرانس اور جرمنی تو اس وقت تک متحدہ اکائی بھی نہیں تھے اور فرانس کی نوزائیدہ صنعتیں تب انتہائی بلند ٹیرف کی فصیلوں میں قید تھیں اور اس حقیقت کو تو آج یکسر فراموش ہی کر دیا گیا ہے۔ مغربی معاشی ماہرین آج دنیا بھر کو یہ پرجوش لیکچر دیتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی معیشتوں کو کھول دیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں یہ ماہرین ''گلوبلائزیشن'' کے بارے میں بہت باتیں کرتے رہے ہیں اور یہ کہتے رہے ہیں کہ یہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس کی مدد سے وہ عروج وزوال کے چکروں سے نجات حاصل کر لیں گے۔ 2008ء کے انہدام نے ان کے سارے خواب چکنا چور کر ڈالے جس کے شدید اثرات ساری دنیا پر مرتب ہوئے۔ اس نے گلوبلائزیشن کے دوسرے رخ کو بے نقاب کر دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام ترقی کی جس سطح تک عالمی معیشت کو لے جاتا ہے اتنی سطح کی گراوٹ کے اسباب بھی یہ پیدا کرتا جاتا ہے۔ کسی ایک ملک میں بھی جنم لینے والا بحران جلد ہی دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیتا ہے۔ عروج وزوال کے چکروں سے نجات تو بڑی دور کی بات ہے،

(c) ketabton.com: The Digital Library

پہلے کے کسی بھی عہد کے مقابلے میں گلوبلائزیشن زیادہ تباہ کن اور عالمگیر اثرات کی حامل ثابت ہوئی ہے۔

بنیادی مسئلہ خود یہ نظام ہی ہے۔ مارکس کے الفاظ میں ''سرمایہ دارانہ پیداوار کے راستے کی حقیقی رکاوٹ خود سرمایہ ہی ہوتا ہے۔'' (سرمایہ؛ جلد 3؛ حصہ سوم) معاشی پنڈت جو مارکس کو غلط قرار دیتے آ رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ عروج و زوال اب ماضی کا قصہ ہو چکے ہیں اور یہ کہ ہم ایک نئے معاشی عہد میں قدم رکھ چکے ہیں، ان کے سبھی فرمان غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ موجودہ ''عروج'' اپنے اندر معاشی چکر کے وہ سبھی خدوخال رکھتا ہے جس کی نشاندہی مارکس نے بہت عرصہ پہلے کر دی تھی۔ سرمائے کے ارتکاز کا عمل ناقابلِ تصور بلندیوں کو پہنچا ہوا ہے۔ ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی دوڑ زوروں پر ہے تاکہ اجارہ داریت میں اضافہ کیا جا سکے اور یہ عمل پیداواری قوتوں کو ترقی بھی نہیں دے رہا جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا۔ اس کے بالکل برعکس کارخانے اس انداز میں بند ہو رہے ہیں جیسے وہ ماچس کی ڈبیاں ہوں۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں محنت کشوں کو روزگار سے باہر دھکیلا جا رہا ہے۔

مانیٹرازم، جسے نیولبرل ازم کی بائبل قرار دیا جاتا ہے، کو جان کینیتھ گلبرائتھ نے اس طرح کوزے میں بند کر کے پیش کیا تھا کہ ''غریبوں کے پاس بے پناہ دولت ہے جبکہ بیچارے امیروں کے پاس بہت ناکافی ہے۔'' ریکارڈ منافع، اپنے پہلو میں ریکارڈ نابرابری بھی لئے ہوئے ہے۔ جریدے ''اکانومسٹ'' کے مطابق ''پچھلے پچیس سالوں کے دوران جو حقیقی رجحان متواتر رواں دواں رہا ہے وہ بالاترین عہدوں پر براجمان لوگوں کی آمدنیوں میں زیادہ سے زیادہ اضافے کا ہے۔'' ایک انتہائی محدود اقلیت انتہائی امیر ترین ہے۔ جبکہ محنت کرنے والوں کا ملکی آمدنی میں حصہ کم سے کمتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سمندری طوفان کترینا نے ساری دنیا کو یہ دکھا دیا کہ کس طرح تیسری دنیا جیسے لوگوں کی طرح سے امریکی شہری دوسرے درجے کے محروم انسانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج امریکی محنت کش دس سال پہلے کی بہ نسبت 30 فیصد زیادہ پیداوار دے رہے ہیں جبکہ ان کی اجرتوں میں بمشکل ہی کوئی اضافہ ہوا ہے۔ سماجی تانا بانا تیزی سے کھچاؤ کی زد میں آتا جا رہا ہے۔ سماج میں تناؤ بہت تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ کیفیت امیر ترین ملکوں میں

(c) ketabton.com: The Digital Library

بھی ہے۔یہ سب کچھ طبقاتی جدوجہد کے ایک بہت بڑے دھماکے کی راہ ہموار کررہا ہے۔ یہ صرف امریکہ ہی کا معاملہ نہیں ہے، ساری دنیا میں ''عروج'' اپنے ساتھ ایک بہت بڑی بیروزگاری کے ساتھ موجود ہے۔ پہلے کی گئی اصلاحات اور دی گئیں رعایتیں واپس لی جارہی ہیں۔عالمی منڈی میں واپسی کیلئے اور مقابلے کی دوڑ میں شامل ہونے کیلئے اٹلی کو پانچ لاکھ محنت کشوں کو روزگار سے نکالنا پڑے گا جبکہ بچ جانے والوں کو اجرتوں میں 30 فیصد کمی قبول کرنا پڑے گی۔ ایک وقت تک تو سرمایہ دارانہ نظام عالمی تجارت (گلوبلائزیشن) کو بڑھاتے ہوئے اپنے تضادات کو دبانے میں کامیاب رہا۔تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ساری دنیا کھنچ کر عالمی منڈی کا حصہ بنتی چلی گئی۔سرمایہ داروں کو نئی منڈیاں اور چین سمیت دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کے مواقع میسر آ گئے۔لیکن اب یہ سب کچھ اپنی حدود کو پہنچ چکا ہے۔امریکی اور یورپی سرمایہ داروں میں اب گلوبلائزیشن اور آزاد تجارت بارے پہلے جیسا جوش وجذبہ باقی نہیں رہا کیونکہ سستی چینی اشیا کے انباران کے گھروں کے باہر لگے ہوئے ہیں۔امریکی سینیٹ میں پروٹیکشنسٹ (Protectionist) مطالبات بلند ہونے شروع ہو گئے ہیں اوران کے اصرار میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے کہ چینی اشیا پر پابندیاں نافذ کی جائیں۔'دوحہ' مذاکرات معطل کر دیے گئے۔تضادات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں ہوسکا۔موجودہ غیر مستحکم ''عروج'' کے غبارے سے بھی ہوا نکلنی شروع ہوگئی ہے۔امریکہ میں صارفیت کا ''عروج'' بنیادی طور پر کم شرح سود کی وجہ سے ہے جو کہ وسیع پیمانے کے کریڈٹ اور قرضوں پر استوار ہے۔یہ عوامل اپنی الٹ میں تبدیل ہوجائیں گے۔عالمی سطح پر ایک نیا بحران دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کیلئے تیار ہے۔چنانچہ گلوبلائزیشن اپنا اظہار سرمایہ دارانہ نظام کے گلوبلائز بحران کی شکل میں کررہی ہے۔

کیا کوئی متبادل نہیں ہے؟

بورژوا ماہرین معیشت اس درجہ تنگ نظر اور کور چشم ہو چکے ہیں کہ وہ متروک ہو چکے سرمایہ دارانہ نظام سے ابھی تک چمٹے ہوئے ہیں جبکہ وہ یہ بھی اعتراف کرنے پر مجبور چکے ہیں کہ اس نظام

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں آ چکا ہے اور کسی بھی وقت منہدم ہوسکتا ہے۔ یہ سوچنا ہی انسانیت کی توہین کرنا ہے کہ نسل انسانی اس قابل ہی نہیں کہ وہ اس گلے سڑے، بدعنوان، زوال آفرین نظام کا کوئی بہتر متبادل نظام تخلیق کر سکے۔ کیا واقعی یہ بات درست ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی متبادل نہیں ہے؟ جی نہیں یہ بات درست نہیں ہے۔ ایک متبادل نظام موجود ہے جو کہ چند ایک لوگوں کے منافعوں کیلئے نہیں بلکہ سب کیلئے پیداوار کا حامل ہوگا۔ یہ نظام انتشار اور بے یقینی کی جگہ ہم آہنگی پر مبنی منصوبہ بندی کو متعارف کرائے گا۔ یہ نظام چند امیر طفیلی افراد کی حکمرانی کی جگہ اس اکثریت کی حکمرانی قائم کرے گا جو کہ سماج کی ساری دولت کو پیدا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس متبادل کا نام سوشلزم ہے۔ کچھ لوگ اس لفظ پر سوال کر سکتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اس نظام کا نام ہی سوشلزم ہے، یہ وہ افسر شاہانہ اور مطلق العنان نظام نہیں جو کہ سٹالنسٹ روس میں تھا۔ سوشلزم ایک خالص جمہوریت ہے جو کہ پیداواری قوتوں پر محنت کش طبقے کی ملکیت، کنٹرول اور انتظام پر مبنی ہوتی ہے۔ کیا یہ نظریہ واقعی اتنا مشکل ہے کہ اسے سمجھا بھی نہ جا سکے؟ کیا یہ تجویز واقعی کوئی یوٹوپیا ہے کہ نسلِ انسانی اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی اور سماج کو پیداوار کے جمہوری منصوبے کے تحت نہیں چلا سکتی!

ایک سوشلسٹ منصوبہ بند معیشت کا نظریہ مارکس یا کسی اور مفکر کی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ معروضی ضرورت سے ابھرنے والی حقیقت ہے۔ ایک عالمی سوشلزم کے امکانات خود سرمایہ دارانہ نظام کے موجودہ حالات میں سے ہی سامنے آ رہے ہیں۔ اس کیلئے محنت کش طبقے کو سماج کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کی ضرورت ہے۔ محنت کشوں کا اقتدار جو بینکوں، اجارہ داریوں کو بے دخل کرتے ہوئے موجودہ اور اب تک کام نہ لائے جا سکی پیداواری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے سماج کے مسائل کو حل کر سکے۔ مارکس نے لکھا تھا کہ "کوئی بھی سماجی نظام اس وقت تک تباہ نہیں ہوتا کہ جب تک وہ پیداواری ذرائع کو ترقی دے سکتا ہے۔" (کارل مارکس، دیباچہ، سیاسی معاشیات پر تنقید) سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل کردہ ترقی نے انسانی سماج کی ایک نئی اور بلند و برتر صورت کیلئے معروضی حالات تیار کر دیے ہیں۔ پچھلے دو سو سالوں کی صنعت، زراعت، سائنس اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

تکنیک کی ترقی نے ایسی رفتار اور شدت اپنالی ہے کہ جس کی تاریخ میں کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

''بورژوا طبقہ آلاتِ پیداوار میں اوران کی وجہ سے تعلقاتِ پیداوار میں اوران کے ساتھ ساتھ سماج کے سارے تعلقات میں لگا تار انقلابی تبدیلیاں کیئے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس کے برعکس پیداوار کے پرانے طریقوں کو بلا کسی ردوبدل کے جوں کا توں قائم رکھنا، پہلے زمانے کے تمام صنعتی طبقات کے بقا کی بنیادی شرط ہوتی تھی۔ پیداوار میں پیہم انقلابی الٹ پلٹ، جملہ سماجی تعلقات میں لگا تار خلل اندازی، دائمی عدمِ استحکام اور ہلچل بورژوازی کے عہد کو پہلے کے تمام زمانوں سے ممتاز کرتی ہے۔''(مارکس اینگلز، کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو ،باب 1، بورژوازی اور پرولتاریہ)

مارکس کے یہ الفاظ کتنے درست ہیں اور آج کے حالات میں کتنے برمحل ہیں! جن مسائل کا ہم سب کو سامنا ہے ان کا حل بھی موجود ہے۔ پچھلے دوسو سالوں کے دوران سرمایہ دارانہ نظام نے دیوہیکل پیداواری قوت تعمیر کی ہے لیکن نظام اس کی پوری صلاحیت سے استفادہ کرنے سے قاصر ہے۔ موجودہ بحران اس حقیقت کی غمازی ہی ہے کہ صنعت، سائنس اور تکنیک اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ جہاں اب ان کو نجی ملکیت اور قومی ریاست کی قیود میں محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ہونے والی ترقی تو خاص طور پر تاریخ میں اپنی مثال ہی نہیں رکھتی۔ نیوکلیر توانائی، مائیکروالیکٹرونکس، ٹیلی کمیونیکیشنز، کمپیوٹرز، صنعتی روبوٹس۔۔۔ان سب کی مدد سے پیداوار ی صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے ان بلندیوں تک پہنچایا جا سکتا ہے جن کا مارکس کے دور میں تصور تک بھی ممکن نہیں تھا اور جس سے ہمیں واضح اندازہ ہو جاتا ہے کہ مستقبل میں سوشلزم کے تحت کیا کیا امکانات وممکنات ہوں گے، جب معیشت منصوبہ بند ہوگی اور وہ بھی عالمگیر سطح پر۔ موجودہ بحران دراصل پیداواری قوتوں کا ان مذکورہ بالا رکاوٹوں کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے جن کی وجہ سے ان قوتوں کا دم گھٹتا جا رہا ہے۔ ایک بار جب صنعت، زراعت، سائنس، تکنیک سرمایہ دارانہ نظام کی ان رکاوٹوں کو پھلانگ کر آزاد ہو جائیں گے تو پیداواری قوتیں کم وقت میں آسانی اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

سہولت سے تمام تر انسانی ضروریات کو پورا کرسکیں گی۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوگا کہ انسانیت اپنی کامل صلاحیت کے احساس سے مستفید اور محظوظ ہوگی۔ اوقات کار میں ایک عمومی کمی، ایک خالص ثقافتی انقلاب کی حقیقی مادی بنیادیں فراہم کرے گی۔ ثقافت، فن، موسیقی، ادب اور سائنس ناقابل تصور بلندیوں کو چھو پائیں گے۔

واحد راستہ!

بیس سال پہلے فوکویاما نے تاریخ کے اختتام کا اعلان کیا تھا، لیکن تاریخ ختم نہیں ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری نوع یعنی انسانوں کی حقیقی تاریخ اس وقت شروع ہوگی کہ جب ہم انسان طبقاتی غلامی سے نجات حاصل کرلیں گے اور جب ہم اپنی قسمتوں اور زندگیوں پر دسترس حاصل کر سکیں گے۔ سوشلزم یہی ہوتا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انسانیت کی ضرورت کی دنیا سے آزادی کی دنیا کی طرف جست۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں انسانیت ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک طرف جدید سائنس اور تکنیک کی حاصلات نے ہمیں وہ ذرائع میسر کردیے ہیں جن کو بروئے کار لاتے ہوئے ہم ان سبھی مسائل اور محرومیوں سے نجات حاصل کرسکتے ہیں جنہوں نے شروع تاریخ سے ایک طاعون کی طرح انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ہم بیماریوں کو ختم کرسکتے ہیں، جہالت سے جان چھڑا سکتے ہیں، بے گھری سے چھٹکارا پاسکتے ہیں، صحراؤں کو گلزاروں میں تبدیل کرسکتے ہیں۔

دوسری طرف وہ راستہ ہے جہاں یہ سارے خواب حقیقت میں مذاق اور المیے میں ڈھل جاتے ہیں۔ جہاں سائنس کی دریافتوں کو وسیع تباہکاریوں کے سامان کی تیاری کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جہاں غربت، بھوک، جہالت اور بیماری عام ہے، جہاں انسانوں کی اذیتوں اور ذلتوں کا کوئی شمار نہیں ہے، جہاں بڑھتی ہوئی امیری محرومیوں کی دلدل کو اور بھی وحشی بناتی جاتی ہے، جہاں ہم ایک انسان کو چاند پر بھیج سکتے ہیں لیکن جہاں ہر سال 80 لاکھ انسان صرف بھوک کی وجہ سے مر جاتے ہیں، جہاں 100 ملین بچے پیدا ہوتے اور گلیوں میں ہی جیتے اور پھر مر جاتے ہیں اور جنہیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس دوران یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ چھت نام کی کوئی چیز بھی ہوا کرتی ہے۔

موجودہ صورتحال کا سب سے خطرناک ترین پہلو انتشار اور اضطراب ہے جس نے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ معیشت، سیاست، سماجیات، سفارتکاری اور عسکریت، غرض ہر سطح پر عدم استحکام غالب آ چکا ہے۔ لوگوں کی اکثریت اس ساری بربریت سے نالاں ہو چکی ہے اور وہ عاجز آ کر ان سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اس قسم کے ردعمل سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اُلٹا اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مارکسزم ہمیں باور کراتا ہے کہ تاریخ کبھی بے معنی نہیں ہوتی۔ موجودہ صورتحال کسی طور کچھ مرد و زن کے پاگل پن یا ان کی کسی موروثی برائی کا نتیجہ نہیں ہے۔ عظیم فلسفی سپینوزا نے کہا تھا کہ ''نہ تو رونا ہے نہ ہی ہنسنا، بلکہ سمجھنا ہے۔'' یہ ایک بالکل درست نصیحت ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس دنیا کو نہیں سمجھتے کہ جس میں ہم زندہ رہتے ہیں تو ہم اسے تبدیل کرنے کے کبھی قابل نہیں ہو سکیں گے۔

جب مارکس اور اینگلز کمیونسٹ مینی فیسٹو لکھ رہے تھے تو وہ دونوں بالترتیب 29 اور 27 سال کے نوجوان تھے۔ وہ یہ سب ایک تاریک رجعتی عہد کے دوران لکھ رہے تھے۔ تب محنت کش طبقہ بظاہر بے عملی کی حالت میں تھا۔ مینی فیسٹو کو برسلز میں لکھا گیا تھا جہاں دونوں مصنفین ایک جبری سیاسی جلاوطنی کے نتیجے میں مقیم تھے۔ جب کمیونسٹ مینی فیسٹو پہلی بار فروری 1848ء کو منظر عام پر آیا، اس وقت پیرس کی گلیوں میں انقلاب سرگرم ہو چکا تھا اور کچھ ہی مہینوں میں اس نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد سرمایہ داری کے محافظین فتح کا جشن مناتے ہوئے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہوں نے سوشلزم کے خاتمے، یہاں تک کہ تاریخ کے ہی خاتمے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے ہم سے وعدہ کیا کہ اب ہم سب کو امن، خوشحالی اور جمہوریت کے نئے عہد سے روشناس کرایا جائے گا اور یہ معجزہ آزاد منڈی کی معیشت کے ہاتھوں سامنے آنے والا ہے۔ اب صرف پندرہ سالوں بعد ہی یہ سب دھواں ہو چکا ہے۔ ایسے واہموں کی ریت سے

(c) ketabton.com: The Digital Library

عمارتیں نہیں کھڑی کی جاسکتیں۔

اس سب کے کیا معنی نکلتے ہیں؟ ہم ایک سماجی نظام کو ایک دردناک مرتی ہوئی حالت میں دیکھ رہے ہیں جو نہ تو جینے کی حالت میں واپس آسکتا ہے نہ ہی اپنی موت مرنے کیلئے تیار ہو رہا ہے۔ جنگیں، دہشت گردی، تشدد اور اموات یہ سب اس عہد کی خصوصیات ہیں جس میں ہم جی رہے ہیں۔ لیکن اسی عہد میں ہی ہم ایک نئے سماج، ایک نئے اور منصفانہ سماج کے جنم کے اثرات بھی محسوس کر رہے ہیں کہ جسمیں سبھی مرد وزن حقیقی زندگی جی سکیں گے۔ ان تباہ کن واقعات اور حالات کے درمیان ہی ایک نئی قوت پیدا ہو رہی ہے۔ نوجوانوں، کسانوں اور محنت کشوں کی انقلابی قوت۔ اقوام متحدہ کے اجلاس سے خطاب کے دوران وینزویلا کے مرحوم صدر ہوگوشاویز نے کہا تھا ''لوگ جاگ رہے ہیں اور لوگ کھڑے ہو رہے ہیں۔'' یہ الفاظ ایک ٹھوس سچائی بیان کر رہے ہیں۔ کروڑوں لوگ عمل کے میدان میں اتر رہے ہیں۔ عراق کی جنگ سے قبل، اس کے خلاف کروڑوں انسان سڑکوں پر امڈ آئے تھے۔ یہ بیداری کی شروعات کا اعلان تھا۔ لیکن تحریک سماج کو بدلنے کے مربوط پروگرام سے لیس نہیں تھی اور یہ اس کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ تبدیلی سے بدگمان اور بدخواہ لوگوں کے دن گنے جاچکے ہیں۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ ہم اپنے راستوں سے ان سب کو ہٹاتے جائیں اور لڑائی کو آگے بڑھاتے جائیں۔ نئی نسل اپنی نجات کیلئے تڑپ اور آرزومندی سے لبریز ہے۔ اسے ایک نعرہ، ایک نظریہ اور ایک پروگرام درکار ہے جو اسے متاثر کرتے ہوئے کامیابی کی طرف لے جاسکے۔ عالمی سوشلزم کی جدوجہد ہی وہ درکار نعرہ، نظریہ اور پروگرام ہے۔

کارل مارکس نے درست کہا تھا ''انسانی نسل کے سامنے دو انتخاب ہیں۔۔۔ بربریت یا سوشلزم!''

(c) ketabton.com: The Digital Library

ضمیمہ

کارل مارکس کے نا قابلِ شکست نظریات

تحریر: فریڈ ویسٹن

ترجمہ: فرہاد کیانی

نجانے کتنی مرتبہ ہم نے یونیورسٹی پروفیسروں، ماہرینِ معاشیات، سیاست دانوں اور صحافیوں کو یہ دعویٰ کرتے سنا ہے کہ مارکس غلط تھا اور اگرچہ اسے سرمایہ داری کے متعلق تھوڑا بہت علم ضرور تھا لیکن وہ سرمایہ دارانہ نظام کی توانائی اور اسکی بحرانات سے نکل کر ہمیشہ آگے بڑھنے کی صلاحیت کو سمجھنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ لیکن گزشتہ چند برسوں کے دوران جب یہ نظام تاریخ کے بد

(c) ketabton.com: The Digital Library

ترین بحران میں دھنستا چلا جا رہا ہے تو وقتاً فوقتاً 'ماہرین' یہ کہتے پائے جا رہے ہیں کہ مارکس درست تھا۔ اس کی تازہ ترین مثال جریدہ 'ٹائم' میں 25 مارچ 2013ء کو چھپنے والا ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے 'مارکس کا انتقام: طبقاتی جدوجہد کے ہاتھوں بدلتی دنیا'۔

پہلے تین پیروں کے شروعاتی جملے کچھ یوں ہیں کہ '' کارل مارکس کب کا مر کر دفن ہو چکا۔۔۔ لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔۔۔ بڑھتے ہوئے شواہد ثابت کر رہے ہیں کہ شاید وہ درست تھا۔'' پہلے پیرے میں لکھا ہے کہ مارکس کو مردہ اور مدفون تصور کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ: سوویت یونین کا انہدام، طبقاتی جدوجہد کی شدت میں کمی، عالمی تجارت کا پھیلاؤ، ایشیا میں معاشی عروج وغیرہ وغیرہ۔

لیکن دوسرے پیرے میں اس نظام کو لاحق اس طویل بحران کو بیان کیا گیا ہے جو غربت اور بے روزگاری میں اضافے کے ساتھ اجرتوں میں کمی کا باعث بن رہا ہے۔ اس کے ساتھ مارکس کی تحریر نقل کی گئی ہے کہ ''ایک جانب دولت کا ارتکاز درحقیقت عین اسی وقت دوسری جانب بدحالی، مشقت کی اذیت، غلامی، جہالت، ظلم اور ذہنی پسماندگی کا ارتکاز ہے۔''

مصنف لکھتا ہے کہ ''1983ء اور 2007ء کے دوران امریکہ میں دولت میں ہونے والے اضافے کا 74 فیصد امیر ترین 5 فیصد کے حصے میں آیا جبکہ غریب ترین 60 فیصد کے پاس جو کچھ تھا اس میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔۔۔''

یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ ابھی تک سب کچھ مارکس کے درست ہونے کی نشان دہی کر رہا ہے، مصنف حسب روایت لکھتا ہے کہ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ مارکس مکمل طور پر درست تھا۔ اس کی پیش کردہ 'پرولتاریہ کی آمریت' ٹھیک طور سے نہیں چل سکی۔'' واضح طور پر یہ سوویت یونین کے انہدام کی طرف اشارہ ہے اور ایسا اس امید پر کیا گیا ہے کہ لوگ مارکس کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیں گے۔

یہ لوگوں کو مارکسزم سے ڈرانے کا پرانا طریقہ ہے۔ لوگوں کو احساس دلایا جاتا ہے اگرچہ مارکس نے سرمایہ داری کے تضادات کا ایک دلچسپ تجزیہ تو کر لیا لیکن وہ کوئی حقیقی اور قابلِ عمل متبادل پیش نہیں کر سکا اور اس لیے ہمیں اپنی قسمت پر صبر شکر کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام میں ہی گزارہ کرنا ہوگا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

لیکن یہ صحافی اس حقیقت کو قصداً نظر انداز کرتے ہیں کہ سوویت یونین میں رائج نظام کمیونزم نہیں تھا۔ مارکس نے کبھی بھی ایسے سوشلزم کی بات نہیں کی تھی جو کہ ایک ملک تک محدود ہو اور وہ بھی 1917ء کے روس جیسا پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ملک۔ انقلابِ روس کی قیادت کرنے والی بالشویک پارٹی کو تعمیر کرنے والے رہنما لینن نے بھی کبھی ایسا نہ سوچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تعمیر میں اپنی تمام تر توانائی صرف کی اور جرمنی کے انقلاب سے اتنی بڑی امیدیں وابستہ کیں۔

''ایک ملک میں سوشلزم'' کا نظریہ پیش کرنے والا سٹالن تھا جس نے اس معاملے پر مارکسزم کے تمام بنیادی نظریات سے انحراف کیا۔ سوویت یونین میں ہونے والے عمل کے بارے میں ٹراٹسکی نے بہت لکھا ہے، خصوصاً اس کی عظیم کتاب 'انقلاب سے غداری' میں ایک صحت مند مزدور انقلاب کے طور پر شروع ہونے والے انقلابِ روس کی وحشیانہ سٹالنسٹ حکومت میں زوال پذیری کی معروضی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نصاب کی کتابوں اور میڈیا میں یہ سب نہیں بتایا جاتا۔ سٹالن کے اقتدار کے سوویت یونین کو مارکس کے نظریات کا ناگزیر انجام بنا کر پیش کرنا بہت کارآمد ہے تاکہ نئی اور آنے والی نسلیں مارکس کی تحاریر کو پڑھنے کی جانب نہ جائیں۔ لیکن سرمایہ دار طبقے اور ان کے حواریوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ آج شدید بحران کے ہاتھوں محنت کشوں اور نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ایک متبادل کی جستجو میں ہے۔

وہ جو چاہے کہتے رہیں، آج مارکس کے نظریات ماضی کی کئی دہائیوں کی نسبت کہیں زیادہ شدت کے ساتھ لوٹ کر آ رہے ہیں۔ اس کی وجہ عالمی پیمانے پر طبقاتی جدوجہد کا احیا ہے۔ ٹائم میگزین کے مضمون میں لکھا ہے کہ ''اس بڑھتی ہوئی نابرابری کا نتیجہ مارکس کی پیش بندی کے عین مطابق ہے، یعنی طبقاتی جدوجہد کی واپسی۔ ساری دنیا کے محنت کشوں کا غصہ بڑھ رہا ہے اور وہ عالمی معیشت میں اپنے جائز حصے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ امریکی کانگریس کے ایوان سے لے کر ایتھنز کی سڑکوں اور جنوبی چین کی پیداواری صنعتوں تک، سرمائے اور محنت کے درمیان کشیدگی سیاسی اور معاشی واقعات کا تعین کر رہی ہے اور اس کی شدت کی مثال بیسویں صدی کے کمیونسٹ انقلابات کے بعد نہیں ملتی۔''

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس مضمون میں بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ امریکہ میں اوباما اور ری پبلیکنز کے درمیان جاری لفاظی میں بھی طبقاتی تضاد کا اظہار ہوتا ہے اور اس بات پر بحث ہو رہی ہے کہ بحران کی قیمت کس طبقے سے کس قدر وصول کی جائے۔ جب بھی اوباما امریکی سماج کے دولت مند حصوں پر ٹیکس بڑھانے کی بات کرتا ہے تو ری پبلکن اس پر طبقاتی جنگ کرنے کا الزام لگاتے ہیں جبکہ وہ خود محنت کشوں اور غریبوں کے خلاف طبقاتی جنگ میں مصروف ہیں۔

لیکن طبقاتی جدوجہد بحران زدہ امریکہ اور یورپ تک محدود نہیں۔ مصنف لکھتا ہے کہ جن ممالک میں حالیہ برسوں کے دوران قابلِ ذکر ترقی ہوئی ہے وہاں بھی طبقاتی جدوجہد میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی بڑی مثال چین ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اگرچہ چین کے شہروں میں اجرتوں میں بڑا اضافہ ہو رہا ہے لیکن امیر اور غریب کا فرق بہت وسیع ہے۔ پیو (Pew) کی جانب سے کئے گئے ایک سروے میں تقریباً آدھے چینیوں کے خیال میں امیر اور غریب میں فرق بہت بڑا مسئلہ ہے، جبکہ 10 میں سے 8 افراد اس بات سے متفق ہیں کہ چین میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہے ہیں۔''

یہ مارکسسٹوں کے لیے قطعاً حیران کن نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سرمایہ داری کے اندر معیشت کی ترقی سماج میں محنت کش طبقے کے کردار کو مضبوط بناتی ہے اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ناگزیر طور پر طبقاتی تناؤ کو جنم دیتی ہے، اگرچہ معاشی عروج ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی مثال ہمیں ماضی میں یورپ میں ملتی ہے جہاں عالمی جنگ کے بعد کے معاشی عروج کے دوران فرانس میں 1968ء اور اٹلی میں 1969ء میں طبقاتی جدوجہد کی تحریکیں پھوٹ پڑیں۔

مضمون کے مطابق ایک چینی محنت کش پینگ مِن کہتا ہے ''باہر کے لوگوں کو ہماری زندگی میں بہت فراوانی نظر آتی ہے، لیکن در حقیقت کارخانے کے اندر زندگی اس سے بہت مختلف ہے۔۔۔ امیر محنت کشوں کا استحصال کر کے دولت کما رہے ہیں۔۔۔ ہم کمیونزم کی راہ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ محنت کش مزید منظم ہوں گے۔۔۔ تمام محنت کشوں کو متحد ہونا چاہیے۔''

(c) ketabton.com: The Digital Library

امریکہ سے لے کر چین اور سپین سے لے کر یونان سمیت دیگر کئی ممالک میں طبقات کے درمیان بڑھتی ہوئی کشمکش کا ایک جائزہ پیش کرنے کے بعد مصنف نتیجہ نکالتا ہے کہ ''ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مستقبل کی بہتری کے مخدوش امکانات کی وجہ سے دنیا بھر کے محنت کشوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ میڈرِڈ اور ایتھنز جیسے شہروں میں لاکھوں افراد نے آسمان سے باتیں کرتی بیروزگاری اور حالات کو مزید بگاڑنے والی کٹوتیوں کے اقدامات کے خلاف مظاہرے کئے ہیں۔''

اس کے بعد وہ اس مضمون کو پڑھنے والے سرمایہ داروں کو تسلی دینے کے لیے لکھتا ہے کہ ''لیکن ابھی تک مارکس کے انقلاب نے عملی جامہ نہیں پہنا۔'' اس بات پر ہم متفق ہو سکتے ہیں۔ ابھی تک سوشلسٹ انقلاب نہیں آیا۔ لیکن مصنف کو امید ہے کہ ایسا کبھی ہو گا بھی نہیں۔ اس بات سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے۔

مصنف محنت کشوں کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ نظام کی تبدیلی نہیں چاہتے بلکہ اس میں اصلاحات کے خواہاں ہیں۔ اس کام کے لیے وہ یونیورسٹی آف پیرس کے نام نہاد ''ماہرِ مارکسزم'' یاک رانسیئے کا سہارا لیتا ہے۔ رانسیئے ان یونیورسٹی پروفیسروں میں سے ہے جو خود کو ترقی پسند ظاہر کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہر وقت مارکسزم کے بنیادی نظریات کو جھٹلا رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً جب وہ کہتا ہے کہ ''مظاہرے کرتے ہوئے طبقات موجودہ سماجی و معاشی نظام کا تختہ الٹنے یا اس کی تباہی کا مطالبہ نہیں کر رہے۔ آج طبقاتی جدوجہد کا مطالبہ نظام کو درست کرنے کا ہے تا کہ دولت کی از سرِ نو تقسیم کر کے اسے طویل مدت کے لیے زیادہ قابلِ عمل اور پائیدار بنایا جا سکے۔'' پروفیسر رانسیئے کا تجزیہ کہ محنت کش سوشلسٹ انقلاب کا مطالبہ نہیں کر رہے، سرمایہ دارانہ نظام کو قائم رکھنے کے خواہش مندوں کی تسلی کا باعث ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''لیبر اور سوشلسٹ پارٹیوں اور ان کی حکومتوں کی کہیں بھی نئی صف بندی اور ان کے ہاتھوں موجودہ معاشی نظام کی تبدیلی کے امکانات بہت ہی محدود ہیں۔''

اس کے استدلال کی بنیاد ہر جگہ پر مزدور تحریک اور خصوصاً اس کے لیڈروں کی موجودہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیفیت ہے۔اگر عالمی محنت کش طبقے کی تحریک کے مستقبل کا انحصار ان ہی لیڈروں پر ہے تو پھر پروفیسر صاحب درست ہیں۔لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ لیڈر ساری زندگی لیڈر نہیں رہتے۔نظام کا بحران تمام نظریات کا امتحان لے رہا ہے۔نظام میں اصلاحات کے خیال پر اس نظام کے بند گلی میں پھنس جانے سے سوال اٹھ رہے ہیں۔اب ماضی کی طرح اصلاحات کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ماضی کی دہائیوں میں طبقاتی جدوجہد کے ذریعے جیتی گئی تمام اصلاحات کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ ہر جگہ پر محنت کشوں کو دو نسلوں پہلے کے حالاتِ زندگی میں جھونکا جا رہا ہے۔ فرانسیسی پروفیسر کی باتوں سے لگتا ہے کہ انہیں اس بات کی سمجھ نہیں کہ ابتدا میں محنت کش یہ سوچ لے کر نہیں آتے کہ انقلاب ہی واحد راستہ ہے۔شروعات میں وہ اجرتوں، حالاتِ زندگی اور فلاح و بہبود پر ہونے والے حملوں کے خلاف لڑتے ہیں۔وہ نظام کے اندر رہتے ہوئے ہی کسی حل کی توقع کرتے ہیں۔وہ معاشی عروج کے دنوں کی واپسی کا خواب دیکھتے ہیں جب اصلاحات ممکن تھیں اور زندگی کچھ قابلِ برداشت لگتی تھی۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ تجربات ان امیدوں کو توڑ ڈالیں گے۔

سارے یورپ، امریکہ، عرب، افریقہ اور ایشیا میں بڑے پیمانے کا سیاسی عدم استحکام ہے جس کا اظہار انتخابات میں ہو رہا ہے۔ایک وقت میں مضبوط رہنے والی پارٹیاں حالات کے دباؤ کے زیرِ اثر برباد ہو چکی ہیں جس کی ایک مثال یونان کی پاسوک (PASOK) پارٹی ہے۔محنت کش حکومت میں بیٹھ کٹوتی کرنے والی ہر جماعت کے خلاف ووٹ دے رہے ہیں۔یعنی محنت کش یہ جانتے ہیں کہ وہ کیا نہیں چاہتے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تک وہ کٹوتیوں کے خلاف لڑائی کے لیے درکار پالیسیوں اور پروگرام کو نہیں جان پائے۔

مارکسسٹ ہمیشہ سچی بات کرتے ہیں، تب بھی جب اسے سمجھنا دشوار ہو۔دنیا بھر کے محنت کشوں اور نوجوانوں کو درپیش مسائل کا سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے کوئی حل ممکن نہیں ہے۔جب تک طاقت سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں ہے وہ اسے اپنی دولت اور مراعات کو بچائے رکھنے کے لیے استعمال کریں گے جس کا بوجھ محنت کش عوام کو اٹھانا پڑے گا۔اس نظام میں اصلاحات نہیں کی جا سکتیں۔اسے تبدیل کرنا ہو گا۔ٹائم میگزین کے اس مضمون کا مصنف لکھتا ہے

(c) ketabton.com: The Digital Library

کہ ''اگر پالیسی ساز منصفانہ معاشی مواقع کو یقینی بنانے کے نئے طریقے دریافت نہیں کرتے تو پھر دنیا بھر کے محنت کش ایک ہو سکتے ہیں۔ مارکس کا انتقام حقیقت بن سکتا ہے۔''

ہم سمجھتے ہیں کہ نہ صرف مارکس کا معاشی تجزیہ بلکہ اس سے اخذ کردہ سیاسی نتائج بھی درست تھے۔ نظام کا بحران ناگزیر طور پر دنیا بھر کے محنت کشوں کو انقلابی نتائج اخذ کرنے پر مجبور کرے گا۔ محنت کش طبقے کی بڑی تنظیموں، پارٹیوں اور ٹریڈ یونینوں میں ایک ریڈیکل تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ان کی موجودہ قیادت کو امید ہے کہ بحران ختم ہو جائے گا اور جلد یا بدیر وہ پہلے والی کیفیت میں لوٹ جائیں گے جہاں انہوں نے مالکان کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ لیکن یہ دیوانے کا خواب ہے!

ہمیں کئی برسوں کی کٹوتیوں اور معیارِ زندگی میں شدید گراوٹ کا سامنا ہے۔ یہ سمجھ آنے پر کہ کٹوتیوں کے مختصر عرصے کے بعد یہ بحران جانے والا نہیں اور اس نظام میں کوئی بہتر مستقبل نہیں، محنت کش طبقے کے پاس واحد راستہ اس نظام کا انقلابی طریقے سے خاتمہ ہوگا۔ موجودہ کیفیت اس جانب بڑھ رہی ہے۔۔۔

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library